رپورٹ

متعلق اجلاس پنجاہ ہشتم

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ

منعقدہ ۲۹، ۳۰، ۳۱ دسمبر ۱۹۳۹ء بمقام کلکتہ

مرتبہ

آنریری سکرٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ

باہتمام محمد مقتدیٰ خان شروانی

شروانی پرنٹنگ پریس علی گڑھ میں ۱۳۵۹ھ ۱۹۴۰ء طبع ہوئی

فہرست کتب مفت طلب کیجئے

چند سال سے کانفرنس نے اپنا بک ڈپو قائم کیا ہے، جس میں اُردو کے مشہور مصنفین مثلاً نواب محسن الملک، مولانا حالی، علامہ شبلی نعمانی، مولانا سلیمان ندوی، مولانا حاجی محمد حبیب الرحمن خاں شروانی (نواب صدر یار جنگ) وغیرہ کی تصنیفات موجود ہیں جو مناسب نرخ پر فروخت ہوتی ہیں۔

بچوں اور عورتوں کی تعلیم و تربیت و نیز فن تعلیم کے متعلق متعدد مفید کتابیں اس بک ڈپو سے مل سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ گزشتہ چند سال میں کانفرنس نے جو عمدہ و دلچسپ کتابیں نہایت اہتمام سے حسن طباعت و کتابت کے ساتھ شائع کی ہیں مثلاً وقار حیات، حیات محسن، یاد ایام، خطبات عالیہ، التربیۃ الاستقلالیہ، سلاطین معبر، تاریخ ملیبار، رسالہ اتالیق، بچوں کی تعلیمی ریڈریں، گنجینۂ اسکاوٹنگ، صولت شیر شاہی، ہمایوں نامہ، حیات رضا، خطبات صدارت پنجاہ سالہ جوبلی وغیرہ خصوصیت کے ساتھ مطالعہ کے قابل ہیں، ایک خاص بات یہ ہے کہ عام فائدہ کے خیال سے باوجود ظاہری و معنوی محاسن کے ان کی قیمتیں بہت کم رکھی گئی ہیں۔ یہ کتابیں بھی کانفرنس بک ڈپو سے ملتی ہیں اور زیادہ خریداری پر تاجروں کو کمیشن بھی دیا جاتا ہے۔

ان کتابوں کے تفصیلی حالات اور ان کی قیمتیں "فہرست کتب" سے معلوم ہوں گی آپ صرف ایک کارڈ لکھ دیجئے فہرست کتب دفتر سے محصول ڈاک لگا کر آپ کی خدمت میں بلا قیمت بھیجدی جائے گی۔ اُس کو پڑھکر آپ اپنے مذاق و شوق کی کتابیں طلب کر لیجئے۔

ملنے کا پتہ

صدر دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل، علی گڑھ

فہرست مضامین

۱ - کانفرنس کی اس رپورٹ میں صفحہ ۱۴۴ کے بعد نواب کمال یار جنگ بہادر صدر اجلاس سالانہ اور آنریبل مولوی ابوالقاسم فضل الحق صاحب صدر استقبالیہ کمیٹی کے خطبات بھی بطور ضمیمہ شامل ہیں۔

۲ - رپورٹ سالانہ کا "حصۂ دوم" جو فہرست ممبران، بیلنس شیٹ اور آڈٹ رپورٹ وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے، اکاؤنٹنٹ کانفرنس کی علالت اور دوسرے موانع کی وجہ سے وقت پر تیار نہیں ہوا، اس لئے رپورٹ ہذا میں شامل نہ ہو سکا، اب یہ حصہ زیر طبع ہے انشاء اللہ چھپنے کے بعد ممبروں کی خدمت میں بھیجا جائے گا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا جو سالانہ اجلاس اکتوبر ۱۹۳۸ء میں صوبہ بہار کے دارالحکومت پٹنہ میں منعقد ہوا تھا، اُس کی صدارت آنریبل مولوی ابوالقاسم فضل الحق صاحب وزیر اعظم و وزیر تعلیم صوبہ بنگال نے فرمائی تھی، آنریبل ممدوح کو تعلیم کی توسیع و اشاعت سے جو دلچسپی ہے وہ محتاج بیان نہیں، اسی بنا پر آپ نے اجلاس پٹنہ میں یہ اعلان بھی فرما دیا کہ وہ کانفرنس کو آئندہ سال اپنا سالانہ اجلاس کلکتہ میں منعقد کرنے کی دعوت دیتے ہیں، وزیر اعظم کے اس اعلان پر سارے حاضرین مجلس نے پُرجوش طریقہ سے اظہار مسرت کیا تھا،

اجلاس کلکتہ کا اعلان تو پٹنہ میں ہو گیا لیکن اس کی تاریخیں متعین نہیں ہوئی تھیں سر سید مرحوم کے زمانہ سے کانفرنس کا سالانہ اجلاس ہمیشہ دسمبر کے آخر ہفتہ میں ہوا کرتا تھا، لیکن گزشتہ پانچ چھ سال میں مسلسل ایسے موانع پیش آتے رہے کہ کانفرنس کا اجلاس بجائے دسمبر کے کسی دوسرے مہینے میں ہوتا رہا،

اجلاس پٹنہ کے کچھ مدت بعد جب صدر دفتر کانفرنس نے کلکتہ سے مراسلت کی تو معلوم ہوا کہ چونکہ دسمبر میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لاہور میں قرار پایا ہے جس میں کلکتہ کے علاوہ بنگال کے دوسرے اضلاع کے مسلمان بھی شریک ہونگے اس لئے دسمبر میں کانفرنس کا اجلاس مناسب نہیں ہے لہذا کانفرنس کے لئے ایسٹر کی تعطیل تجویز کی گئی،

لیکن اس قرارداد کے بعد اکتوبر میں یہ معلوم ہوا کہ اب **مسلم لیگ** کا اجلاس دسمبر میں نہیں بلکہ ایسٹر کی تعطیل میں ہوگا، ایسی حالت میں اب اس کے سوا اور کوئی صورت نہ تھی کہ کانفرنس کا اجلاس دسمبر ہی میں کر لیا جائے لیکن دسمبر چونکہ قریب آگیا تھا اس لئے یہ اندیشہ تھا کہ شاید اس قدر قلیل وقت میں اجلاس کا اہتمام نہ ہو سکے تاہم خاکسار آنریری سکرٹری کانفرنس نے ذمہ دار اصحاب سے مراسلت کی نیز منشی **مصطفیٰ** حسن صاحب سفیر کانفرنس کو خطوط دے کر آخر اکتوبر میں کلکتہ بھیجا، اس سعی و کوشش کا یہ نتیجہ نکلا کہ کانفرنس کا اجلاس دسمبر میں طے پا گیا جس کی تفصیل یہ ہے کہ آنریبل مولوی ابوالقاسم **فضل الحق** صاحب وزیر اعظم بنگال کی دعوت پر ۱۲۔ نومبر ۱۹۳۹ء کو **مسلم انسٹی ٹیوٹ کلکتہ** میں تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت خود وزیر اعظم نے فرمائی۔

جناب صدر نے اس جلسہ کا مقصد بیان کرتے ہوئے یہ بھی ظاہر فرمایا کہ "آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کے اجلاس پٹنہ (۱۹۳۸ء) کے موقع پر ممدوح نے کانفرنس کے آئندہ سالانہ اجلاس کو کلکتہ میں منعقد کرنے کی دعوت دی تھی،

جناب صدر کی تقریر کے بعد اس معاملہ پر کافی بحث و گفتگو ہوئی اور آخر کار یہ طے پایا کہ صدر دفتر کانفرنس کو باضابطہ دعوت نامہ بھیجا جائے اور اجلاس کے انتظام کے لئے "مجلس استقبالیہ" قائم کی جائے، کانفرنس کے سالانہ اجلاس کی تاریخیں ۲۹،۳۰،۳۱ دسمبر ۱۹۳۹ء قرار پائیں اور اجلاس کا مقام "محمد علی پارک" تجویز کیا گیا، اور حسب ذیل اصحاب کا مجلس استقبالیہ کے مختلف عہدوں کے لئے انتخاب ہوا،

صدر مجلس استقبالیہ:۔ آنریبل مولوی ابوالقاسم فضل الحق وزیر اعظم و وزیر تعلیم بنگال،

جنرل سکرٹری مجلس استقبالیہ:۔ آنریبل حسین شہید سہروردی ایم اے، بی ایس سی، بی سی ایل (آکسن) بیرسٹرایٹ لا وزیر حکومت بنگال،

خازن:۔ حاجی محمد امین صاحب تاجر و رئیس اعظم کلکتہ،

مندرجہ بالا عہدہ داروں کے علاوہ حسب ذیل اصحاب مختلف صیغوں کے انچارج منتخب ہوئے،

سکرٹری شعبہ پبلسٹی:۔ مسٹر راغب احسن ایم اے،

سکرٹری شعبہ مہمانان:۔ خانصاحب سید احمد رشید صاحب،

سکریٹری شعبہ طعام و مدارات مہمانان :- حاجی منور الدین صاحب
سکریٹری شعبہ پنڈال :- خانصاحب محمد محسن خاں صاحب،
سکریٹری شعبہ رضاکاران :- ملا جان محمد صاحب،
سکریٹری شعبہ ٹکٹ :- مسٹر امیر الدین احمد صاحب،
سکریٹری شعبہ دورہ سفراء :- خان بہادر ایس ایم مرشد صاحب،

اسی جلسہ میں مجلس استقبالیہ کی ورکنگ کمیٹی کا انتخاب عمل میں آیا اور یہ طے پایا کہ آئندہ کمیٹی میں مزید اصحاب کا اضافہ ہوسکتا ہے، ورکنگ کمیٹی میں علاوہ مندرجہ بالا عہدہ داروں اور سکریٹریوں کے حسب ذیل اصحاب بھی شریک کئے گئے،

(۱) خانصاحب بدیع الرحمان صاحب (۲) ایم اے آر صدیقی صاحب (۳) مولوی ایس اے حمید صاحب (۴) خان بہادر بدر الدین صاحب (۵) مسٹر کے شہاب الدین صاحب (۶) خان بہادر مولوی اسد اللہ صاحب (۷) حاجی ولی الاسلام صاحب (۸) حافظ شمشاد احمد صاحب (۹) حاجی عبد الرزاق عبد الستار صاحب (۱۰) مولوی محمد اکرم خاں صاحب (۱۱) مسٹر سید ابن امام صاحب (۱۲) ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی (۱۳) خان بہادر رضا علی وحشت (۱۴) خان بہادر مرزا ابو جعفر صاحب (۱۵) شفیق الدین صاحب (۱۶) بیگم سید احمد رشید صاحبہ (۱۷) سید محمد افضل صاحب، بیگم سید احمد رشید کو لیڈیز سکریٹری بھی منتخب کیا گیا

مجلس استقبالیہ کی تجویز پر مندرجہ ذیل اصحاب کے ایک وفد نے فراہمی کے لئے شہر میں دورہ کیا،

(۱) خان بہادر خلیفہ اسد اللہ صاحب،
(۲) آنریبل عبد الرزاق عبد الستار صاحب (ممبر کونسل آف اسٹیٹ)
(۳) ملا جان محمد صاحب،
(۴) ایس اے حمید صاحب،
(۵) خان صاحب سید احمد رشید صاحب،
(۶) حافظ شمشاد احمد صاحب،
(۷) امیر الدین خاں صاحب ایڈوکیٹ،

یہ دورہ کامیاب رہا اور بہت سے اصحاب نے اجلاس کانفرنس کے مصارف کے لئے

چندہ عطا کیا (جس کی تفصیل یکم دسمبر ۱۹۳۹ء کے کانفرنس گزٹ میں شائع ہو چکی ہے) مندرجہ بالا میٹنگ کے بعد بھی ورکنگ کمیٹی کے متعدد جلسے کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے انتظامات کے لئے منعقد ہوتے رہے۔

کانفرنس کے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لئے بمشورہ مجلس استقبالیہ نواب کمال یار جنگ بہادر کا نام تجویز کیا گیا جو حیدرآباد کے مشہور اور خاندانی امیر نواب خانخاناں بہادر کے فرزند اکبر ہیں، اور علی گڑھ میں بھی تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔

چونکہ یہ فیصلہ کہ کانفرنس کا اجلاس دسمبر میں ہوگا - ۱۲ نومبر ۱۹۳۹ء کو ہوا اس لئے مجلس استقبالیہ کو کام کرنے کے لئے زیادہ وقت نہیں ملا، لیکن باوجود قلت وقت مجلس کے عہدہ داروں اور کارکنوں نے ایسی سرگرمی سے کام کیا کہ اجلاس کے آغاز سے پہلے تمام انتظامات مکمل ہو گئے۔

مجلس استقبالیہ نے ہزاروں اعلانات اور پوسٹروں کے علاوہ بکثرت دعوتی خطوط بھی صوبہ بنگال اور دوسرے صوبوں میں بھیجے اور کلکتہ کے اردو اخبارات نے کانفرنس کے متعلق ہر قسم کے اعلانات نہایت فراخدلی سے شائع کئے، اس بارہ میں مسٹر راغب احسن ایم اے کی سعی و کوشش خاص طور پر لائق شکریہ ہے جن کے متعلق پروپیگنڈے کی خدمت تھی۔

مہمانوں کے قیام کا انتظام "مدرسہ عالیہ کلکتہ" کی وسیع عمارت میں کیا گیا تھا، لیکن بہت سے مہمان اپنے احباب کے یہاں قیام پذیر تھے، مولوی محمد امین صاحب تاجر و رئیس کلکتہ کا وسیع محل بھی مہمان خانہ بنا ہوا تھا جہاں ڈاکٹر سر شاہ سلیمان صاحب بالقابہ اور آنریری سکرٹری کانفرنس نیز دوسرے متعدد معزز مہمان قیام فرما تھے۔

اجلاس کے لئے ایک نہایت وسیع پنڈال محمد علی پارک میں تیار کیا گیا تھا، جس میں ہزاروں مہمانوں کی نشست کا انتظام تھا، لیکن یہ پنڈال نہایت سادہ اور غیر ضروری زیبائش سے پاک رکھا گیا تھا۔

کلکتہ میں ہر جگہ اجلاس کانفرنس کا چرچا تھا، دو تین روز پہلے ہی دور دور کے اضلاع سے بہت سے مہمان مختلف ٹرینوں اور لاریوں کے ذریعہ سے آ رہے تھے۔

نواب کمال یار جنگ بہادر صدر اجلاس ۲۵ - دسمبر ۱۹۳۹ء کو ۱۰½ صبح کو مدراس میل سے ہوڑا اسٹیشن پر تشریف لے آئے جہاں آپ کا پُرجوش طریقہ سے استقبال کیا گیا

مجلس استقبالیہ کے عہدہ داران کلکتہ کے عمائد اور مختلف اسلامی اداروں کے نمائندے پلیٹ فارم پر موجود تھے، خان صاحب احمد رشید صاحب نے حاضرین کا نواب صاحب سے تعارف کرایا، اس کے بعد ممدوح اپنی قیام گاہ پر تشریف لے گئے،

پہلا اجلاس

بمقام محمد علی پارک، کلکتہ

۲۹ دسمبر ۱۹۳۹ء روز جمعہ

۱۰ بجے صبح کو تلاوت کلام مجید سے اجلاس کا آغاز ہوا، جب تک تلاوت جاری رہی تمام حاضرین مجلس ادب کے ساتھ کھڑے رہے، تلاوت کے بعد خواجہ محمد امین چشتی نے ڈاکٹر اقبال کا مشہور ترانہ "ہندوستاں ہمارا" خوش آئند لہجہ میں سنایا جس سے تمام حاضرین محظوظ ہوتے ہوئے، اس کے بعد جناب ابوالقاسم فضل الحق صاحب وزیر اعظم و وزیر تعلیم بنگال، صدر جماعت استقبالیہ نے اپنا "خطبہ صدارت" پڑھا، یہ خطبہ بہت سے کار آمد و مفید معلومات پر مشتمل تھا لیکن تنگیٔ وقت کا لحاظ کرتے ہوئے جناب صدر استقبالیہ نے صرف اس کے اہم اور ضروری حصے پڑھ کر سنائے، یہ خطبہ رپورٹ کے آخر میں شامل ہے،

خطبہ استقبالیہ کے بعد خاکسار آنریری سکرٹری کانفرنس نے نواب کمال یار جنگ بہادر کے انتخاب صدارت کی تحریک کرتے ہوئے کہا،

معزز حاضرین و خواتین! اس کانفرنس کی صدارت ہمیشہ اعیان ملک نے فرمائی ہے جس پر اس مجلس کو فخر ہے لیکن آج یہ پہلا موقع ہے کہ حیدرآباد کے طبقہ امراء میں سے اس کے ایک رکن اس اجلاس کے صدر منتخب ہو رہے ہیں، یہ امر باعث مسرت ہے کہ اس انتخاب میں اعلیٰ حضرت نظام کی منظوری اور پسندیدگی بھی شامل ہے،

نواب کمال یار جنگ بہادر حیدر آباد کے اُس حلقہ امرا سے تعلق رکھتے ہیں جو زمانہ گزشتہ میں سیف و قلم دونوں کا مالک رہا ہے، آپ کے اجداد اکبر کے زمانہ میں ہندوستان آئے احمد شاہ کے زمانہ میں خانخاناں اور نظام الامراء کے خطابات عطا ہوئے اس کے بعد یہ خاندان حیدر آباد میں منتقل ہو گیا، لیکن اس موقع پر میں پُرانی تاریخ کا اعادہ کرنا نہیں چاہتا، نواب صاحب کے والد نواب خانخاناں مرحوم کو میں نے حیدر آباد میں دیکھا تھا، نواب صاحب مرحوم بہت علم دوست تھے اور فن خطاطی میں انھوں نے مشہور کاتب عماد حسنی کی تقلید کی تھی، میں نہایت صمیم قلب سے تحریک کرتا ہوں کہ نواب صاحب اس اجلاس کی صدارت قبول فرمائیں،

تحریک کے بعد آنریبل ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان صاحب جج فیڈرل کورٹ و وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اس تحریک کی تائید کرتے ہوئے فرمایا کہ میرے لئے یہ امر از حد باعث مسرت ہے کہ یہ خوشگوار فرض میرے ذمہ کیا گیا ہے کہ میں اس تحریک کی تائید کروں جو میرے بزرگ دوست نواب صدر یار جنگ بہادر نے کی ہے، مجھے اس تحریک کی تائید کرنے سے خوشی ہے، لائق محرک نے اپنی فصیح و بلیغ تقریر میں نواب صاحب کی خصوصیات بیان کر دی ہیں، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو اس کا فخر ہے کہ نواب کمال یار جنگ بہادر اس کے اولڈ بوائے ہیں، اور علی گڑھ کے اولڈ بوائز میں جو ممتاز ہستیاں ہیں اُن میں سے آپ بھی ہیں، حیدر آباد جانے والوں سے معلوم ہوا ہے کہ آپ یہاں کے معاملات سے اب بھی دلچسپی لیتے رہتے ہیں، اور آپ نے آفتاب ہوسٹل کی تعمیر میں مالی امداد بھی دی تھی، آپ علم دوست اور تعلیم کے حامی ہیں اس لئے مجھے امید ہے کہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کے لئے آپ کی صدارت نہایت موزوں ہوں گی،

ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان صاحب بالقابہ کی تائید کے بعد سیٹھ احمد ہارون جعفر صاحب سکرٹری بمبئی پریسیڈنسی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس پونہ نے تائید مزید کرتے ہوئے کہا،

معزز حضرات! وقت قلیل ہے اس لئے میں کچھ زیادہ عرض نہیں کر سکتا، نواب صدر یار جنگ بہادر اور سر شاہ محمد سلیمان صاحب نے تحریک و تائید کے سلسلہ میں جو کچھ فرمایا ہے میں اُس کی تائید کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ نواب کمال یار جنگ بہادر اس جلسہ کی صدارت قبول فرمائیں گے،

آخر میں آنریبل حسین شہید سہروردی وزیر بنگال اور سکرٹری مجلس استقبالیہ نے بطور تائید مزید فرمایا حضرات اس تحریک کی مزید تائید ضروری نہیں کیونکہ آپ سب حضرات نے اسکو پہلے ہی قبول فرما لیا ہے اس مجمع میں نواب کمال یار جنگ بہادر سے زیادہ اور کوئی صدارت کے لئے موزوں نہیں ہے مسلمانوں کو

تعلیم کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، ہم مسلمانوں کو گھٹی میں یہ پلایا جاتا ہے کہ تعلیم حاصل کرو، لہٰذا اس موقع پر ریاست حیدرآباد کی طرف سے ہماری تعلیمی تحریک میں امداد و تائید ایک قابل قدر چیز ہے،

مندرجہ بالا تقریروں کے بعد مجمع کی عام تائید سے نواب کمال یار جنگ بہادر اجلاس کے صدر قرار پائے اور آنریری سکرٹری کانفرنس نے ممدوح کو ہار پہنائے،

اس کے بعد بنگال کے مشہور شاعر خان بہادر سید رضا علی صاحب وحشت نے جناب صدر کے خیر مقدم میں حسب ذیل نظم پڑھی جو بڑی دلچسپی سے سُنی گئی،

آئے کمال یار جنگ زینتِ صد انجمن لئے — ذاتِ پُر از صفات میں فیضِ شہِ دکن لئے
کانفرنس کیوں نہ ہو شمعِ ہدایتِ وطن — بہتی ہے آج ملک میں نہرِ سخاوتِ دکن
رہبرِ ملک و قوم ہیں آج کمال یار جنگ — ملک کے اور قوم کے تاج کمال یار جنگ
ساتھ کمال یار کے اور بھی ذی کمال ہیں — آپ کے ہمجلیس ہیں آپ کے ہم خیال ہیں
قوم کے اور ملک کے جمع یہاں ہیں رہنما — ملک ہے اُن کا مقتدی ملک کے وہ ہیں مقتدا
غور طلب ہیں مسئلے جن پہ نظر ہے آپ کی — سب کی اُدھر ہی ہے نگاہ آج جدھر ہے آپکی
آپ نے ہم کو سرفراز اپنے ورود سے کیا — فکر ہے کیسے شکریہ آپ کا ہم کریں ادا

عرض کریں گے شوقِ دل نعرۂ مرحبا سے ہم
آپ کی تہنیت کا کام لیں گے فقط دعا سے ہم

خیر مقدم کی نظم کے بعد جناب صدر نے اپنا مختصر خطبہ صدارت پڑھا جو پوری توجہ سے سُنا گیا (یہ خطبہ اس رپورٹ کے آخر میں بطور ضمیمہ شامل ہے)

اس کے بعد مولوی حاجی ابوالحسن صاحب سابق ڈائرکٹر ریاست کشمیر نے وہ پیامات پڑھ کر سنائے جو خطوط اور تاروں کے ذریعہ سے ملک کے مختلف حصّوں سے موصول ہوئے تھے اور جن میں اپنی عدم شرکت پر افسوس و معذرت کے ظاہر کرنے کے علاوہ کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے کامیاب و نتیجہ خیز ہونے کی توقع ظاہر کی گئی تھی،

یہ پیامات ملک کے ممتاز و سربرآوردہ اصحاب کے تھے مثلاً مسٹر محمد علی جناح، رجسٹرار صاحب آگرہ یونیورسٹی، سر فضل حسین صاحب وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی، سر رحمت اللہ جیانی، مسٹر بی طیب جی، ڈاکٹر عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو، سر محمد حبیب اللہ صاحب مدراس،

آنریبل سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب، سر شیخ عبد القادر صاحب، نواب مظفر خاں صاحب لاہور، فدا علی صاحب دیوان بیچے پور، ہیڈ مسٹریس مانٹیسوری وغیرہ۔

ان بیانات کے سنانے کے بعد کانفرنس کا پہلا عام اجلاس خیر و خوبی سے ختم ہوا، اور مولوی حاجی ابو الحسن صاحب نے صدر کی طرف سے یہ اعلان کیا کہ دوسرا جلسہ جو شعبہ اسلامی تمدن و تاریخ کا اجلاس ہوگا بعد نماز جمعہ ڈھائی بجے سہ پہر کو شروع ہوگا۔

آج جمعہ کا دن تھا اس لئے اجلاس کا زیادہ دیر تک جاری رکھنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔

اجلاس شعبہ اسلامی تمدن و تاریخ

بعد نماز جمعہ ۳ بجے سہ پہر کو تلاوت کلام مجید کے بعد شعبہ اسلامی تمدن و تاریخ کا اجلاس زیر صدارت آنریبل خان بہادر عزیز الحق صاحب اسپیکر بنگال اسمبلی و وائس چانسلر کلکتہ یونیورسٹی شروع ہوا، سب سے پہلے ڈاکٹر امیر حسن صاحب صدیقی ایم اے پی ایچ ڈی سکریٹری شعبہ نے اپنی مختصر رپورٹ پڑھی، اس کے بعد جناب صدر نے اپنا پر مغز خطبہ صدارت سنایا جو انگریزی میں چھپا ہوا موجود تھا، خطبہ بیحد پسند کیا گیا، اور بار بار صدائے تحسین و آفرین بلند ہوئی، خطبہ کے اختتام پر مسٹر عبد الرحمن صدیقی نے اس کا خلاصہ اردو میں عمدہ طریقہ سے بیان کیا،

مولوی محمد عزیز صاحب ایم اے لکچرر شعبہ اردو نے اس خطبہ کا نہایت عمدہ ترجمہ کیا ہے جو مولوی صاحب موصوف کے شکریہ کے ساتھ ذیل میں شائع کیا جاتا ہے۔

خطبہ صدارت شعبہ اسلامی تمدن و تاریخ

آج سے کم و بیش چودہ سو سال پہلے عرب کی سرزمین ایک ولادت باسعادت سے مشرف ہوئی وہ سرزمین جو طلوع آفرینش سے ناہموار پہاڑیوں اور چٹانوں کے لئے مشہور ہے ریت کے خوفناک ٹیلوں سے گرانبار، بے راہ و منزل، مسلسل و غیر منقطع ریگزاروں کی سرزمین جہاں بیابانی سرابوں اور خال خال نخلستانوں کے سوا انسانی نظروں کے لئے کوئی سامان تسکین نہیں۔ نبی کریم کی بعثت سے قبل عرب کا پیرہن قبائلی جنگ اور سفاکیوں سے تار تار و خونچکاں تھا۔ اور یہاں کے

باشندے جہالت اور توہم پرستی کی انتہائی مذلتوں میں گرفتار تھے،

ولادت سے قبل باپ کا سایۂ شفقت سر سے اُٹھ چکا تھا، چھ سال کی عمر میں ماں کی آغوش رحمت سے محروم ہو گئے، نوشت و خواند سے ناآشنا، اقربا کے جور و ستم کے آماجگاہ، جس شہر کو آپ کی ولادت کا شرف حاصل ہوا اُس نے رفاقت سے کنارہ کیا — باینہمہ سنگستان حرا کے غار سے باہر تشریف لاکر نوع انسان کو ایمان و امید کا پیام پہنچاتے ہیں!

تقریباً چودہ صدیاں گزر چکی ہیں۔ انسانی تاریخ کے اس دور میں انسان، انسانی ذہن، فکر، ممالک، نسلیں اور تہذیب و تمدن نے کیسے کیسے پلٹے کھائے، پنپے اور پروان چڑھے لیکن ایمان و ایقان کے جن بنیادی اصولوں اور اخلاق و معاشرت کے جن قوانین کی تبلیغ کر دی گئی تھی اُن کی حیات بخشیاں صدیوں بعد آج بھی مسلّم ہیں!

اُس عہد میں جبکہ ہر ملک ایک دوسرے کو وحشی گردانتا تھا، پیغمبر اسلام نے نوع انسانی کی جمہوریت اور اخوت انسانی کا نصب العین پیش کیا۔ دنیا آج بھی ایک انجمن اقوام کے بروئے کار لانے میں سرگرداں ہے! سود خواری کی لعنت سے آزاد ہونے کے لئے امریکا اور دوسرے ممالک نے کیا کچھ نہ کیا۔ روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ کسی کوشش سے دریغ نہ کیا لیکن ایک پیش نہ گئی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی گرم نوائی نے اسے یک لخت ممنوع قرار دے دیا۔ آپ نے صاف صاف لفظوں میں فرما دیا کہ سود بہرصورت و بہر نوع انسانی جمعیت کے لئے لعنت عظیم ہے۔ دوسری طرف دنیا کے واضعان قوانین آج سود کی اُن بے پناہ اور نافرجام شرحوں کی انسداد کے لئے قوانین بنا رہے ہیں جن سے سیدھے سادے لوگ سود خواروں کے رحم و کرم کے محتاج بن جاتے ہیں۔ آپ نے رمضان المبارک میں روزہ رکھنے کی ہدایت کی۔ دنیا کے ماہرین طب رفتہ رفتہ روزہ کے مفید و مؤثر ہونے کے قائل ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ نے نکاح کے قوانین منضبط فرمائے جن کے بارہ میں بہت سے اہل فکر کا خیال ہے کہ وہ حقیقتاً ایک ہی عورت سے شادی کرنے پر منطبق ہوتا ہے اور اگر تعدد ازدواج کو راہ دیا جائے تو بعض قیود کی بڑی سختی سے پابندی کرنی پڑتی ہے۔ معاشرتی ترقی کے تمام منازل کا لحاظ رکھتے ہوئے اس امر کی بھی اجازت دی گئی کہ روابط عقد میں توافق نہ پیدا ہو تو طلاق بھی عمل میں آ سکتی ہے۔ مغرب آج اپنے قوانین نکاح کی خلاف ورزی پر سرگرداں ہے اور اس کے بعض مفکر جنگ عظیم کے بعد سے اس امر پر سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں کہ تعدد ازدواج کے خلاف جو ممانعت نافذ ہے اُسے

ناگہانی اور شدید ضرورتوں کے مواقع پر کیوں نہ اٹھالیا جائے۔ یہ صورت حال اُن مبالک کے علاوہ ہے جو جنگ زائیدہ بچوں اور لاعلم والدین کے بچوں کے ہسپتال کے سلسلہ میں رونما ہیں آپ نے ہر ذی استطاعت مسلمان کو ہدایت کی ہے کہ کم سے کم ایک بار حج کے اجتماع عظیم میں شریک ہو۔ آج بھی دنیا اجتماع عالم اور بین الاقوامی کانفرنسوں کی اہمیت تسلیم کرتی ہے۔ آپ نے فرمایا ہر انسان ایک دوسرے کا بھائی ہے اور باہمی رفاقت کے رشتہ میں منسلک ہے دوسری طرف دیکھئے اختلاف رنگ و نسل کے عقدہ لاینحل نے عالم انسانی کو کس درجہ مشوش و مایوس کر رکھا ہے!

یہ سب کچھ حکومت کے اقتدار یا قانون کے مداخلت کے بغیر ہوا' تاریخ انسانی کی قلیل ترین مدت میں انسانی ذہن و فکر میں انقلاب عظیم برپا ہوگیا اور دنیائے معاشرت میں ایک نظام نو کار فرما ہوا' منتشر و منفرق ممالک باہم برسرپیکار اقوام' مختلف سرشت اور نظریے رکھنے والی جماعتیں جن کی عادت اور تہذیبی روایتیں ایک دوسرے سے متباین تھیں اور گوناگوں نسلوں اور زبانوں کے لوگ نہ صرف ایک ہی رشتہ مذہب میں منسلک ہوگئے' بلکہ جمہوریت اسلام کے ایسے تصور میں متحد و مدغم ہوگئیں جس میں معاشرت کے طور طریقے' اخلاقی نظریے اور ذہنی رجحانات سب کے لئے ایک اور یکساں تھے۔ ماضی کا بہترین حصہ مجتمع کر کے برسرکار لایا گیا۔ اور انسانوں اور ملکوں کو ایک گونہ مافوق الفطرت کی قوتوں سے استوار و بیدار کر دیا گیا۔ مغرب کا سرا مشرق سے جوڑا گیا۔ یونانی اور رومی' ترک اور تاتار' چینی ایرانی' ہندی' مصری' اندلسی اور بربری ایک ہی صف میں لاکھڑے کر دئے گئے۔ ارسطو' سقراط' اور افلاطون' ارشمیدس اور بطلیموس' سنکھیا اور پتانجلی' لیلاوتی اور اقلیدس زاویہ خمول سے نکال کر دنیا سے روشناس کرائے گئے۔ ان کے امتزاج سے ایک نئی چیز ظہور میں آئی' جس سے جدید فنون و فلسفہ' ریاضیات و فلکیات' علم سکون و حرکت' طب' معدنیات اور ہیئت سے اور فنون و حکمت عالم وجود میں آئے۔ وہ مذہب جس نے انسانی تاریخ کے تاریک عہد میں ٹیگس و گواڈلکیور کے کناروں سے بحرالکاہل کے ساحلوں تک دنیا کا چہرہ جگمگا دیا جس نے اپنی سطوت و شکوہ کے انوار سے دریائے نیل اور دجلہ و فرات کی موجوں کو تابناک بنایا اور اپنے خزانے گنگا اور ہوانگ ہو کے میدانوں میں بکھیرے مذہب اسلام ہے جس نے کرہ ارض کی کروڑوں مخلوق کے قلوب کو گرما رکھا ہے۔ وہ ذہنی و اخلاقی رویہ و

رجحان جس نے اس دین کے حلقہ بگوشوں میں زندگی کی روح پھونکی، انسانی سرگرمیوں کے گوناگوں مظاہر مثلاً سیاست، معاشرت اور اقتصادیات میں جلوہ گر ہوا جسے عام طور پر اسلامی ثقافت یا اسلامک کلچر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

کم وبیش چودہ سو سال تک اس ثقافت کا محرک اعظم دین متین کے محور پر گردش کرتا رہا ہے اور باوجود اس کے کہ اس نے دوسرے کلچروں کو قوت حیات بخشی، از سر نو زندہ کیا اور چمکایا، اس نے تاریخ کے کسی دور میں نہ اپنی انفرادیت گنوائی اور نہ اپنے آپ کو مغلوب ہونے دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی مدنظر رکھئے کہ باوجود اس کے کہ دنیا اور اس کی ارتقا کی تاریخ اسلام کی فیض بخشیوں سے گرانمایہ اور انسانی تاریخ کا ہر پہلو اسلامی اثرات سے روشن و رنگین ہے، تہذیب جدید کو انسانیت کے کسی نصب العین تشکیل کرنے کی توفیق اب تک نہیں ہوئی، روح کے اندرونی مطالبات اور بیرونی زندگی کی مقتضیات میں توازن و توافق پیدا کرنے کے باوجود اسلام کا نصب العین نمایاں طور پر عملی اور قابل حصول رہا ہے۔ بے ہنگی اسلام کی فطرت کے منافی ہے۔ اس نے ان تمام بندشوں کو توڑا ہے جو مماثلت کے رابطوں میں حائل ہوئیں۔ اس نے مشرق کو مغرب سے ہمکنار کرکے جمہوریت انسانی کے ایک نئے تصور کی تشکیل کی۔ صدیاں گزر گئیں لیکن اس کے خصوصی امتیازات جوں کے توں ہیں۔ اور کروڑوں نفوس اب بھی حیات و قوت کے اس سرچشمہ صافی سے سیراب و فیضیاب ہو رہے ہیں۔ میرے لئے ناممکن ہے کہ اس تھوڑے سے وقت میں جو مجھے میسر ہے میں اسلام کے ان تمدنی برکات کا شمہ برابر بھی احاطہ کرسکوں جو دنیا کو اس سے پہنچے ہیں۔ لیکن میں آپ کے عفو و کرم پر بھروسہ کرکے نہایت مختصر الفاظ میں ان تمدنی اثرات و برکات کا تذکرہ کر دینا چاہتا ہوں جن کے نقوش تاریخ ہند کے صفحات پر ثبت ہیں۔

مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندوستان جس حال میں تھا آیئے ذرا دیر کے لئے اسے چشم تصور سے دیکھیں۔ انسانی حقوق، ولادت و ولدیت جیسے امور اتفاقی سے متعین ہوتے تھے۔ صحائف مذہبی کا مطالعہ ان طبقوں کے علاوہ جنہیں امتیازی حقوق حاصل تھے بقیہ سب کیلئے ممنوع تھا۔ برہمنوں کی معبودی کو قائم رکھنے کیلئے بڑے سخت قوانین نافذ تھے۔ بدھ مت نے اس رویہ کو کچھ دنوں ایک حد تک روکے رکھا۔ لیکن فوراً ہی بعد ہندو اور بودھ مذہبوں میں بالادستی کے لئے شدید مناقشہ شروع ہوا۔ کچھ عرصہ تک تو بودھ مذہب ہر مخالفت پر غالب آیا اور ہندو مت کوہستان ہمالیہ کی وادیوں میں پناہ گزین ہونے

پر مجبور ہوا۔ یہ غلبہ اتنا مکمل تھا کہ جب بنگال کے ایک راجہ نے ہندومت کو ازسر نو زندہ کرنا چاہا تو بنگال میں سے ایک بھی اچھا برہمن نہ مل سکا۔ چنانچہ قنوج سے پانچ برہمن بلانے پڑے لیکن بودھ مذہب کو جلد ہی اس ملک کے حدود سے باہر پناہ لینی پڑی۔ اقتدار و استیلا کی اس جنگ کے بعد ذات پات کے قیود اور سخت ہو گئے۔

اُن تمام لڑائیوں کی خونچکاں داستانوں کو دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں معلوم ہوتی جن سے ہندوستان کی معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی زندگی تہہ و بالا ہو چکی تھی لیکن یہ ملحوظ رکھئے کہ جس وقت اسلام کا قدم ہندوستان میں آیا یہاں بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں جو ایک دوسرے کے خلاف سازش کرتی اور لڑتی رہتی تھیں۔ تمام ملک میں ابتری و بدامنی پھیلی ہوئی تھی اور ہندوستان کی وحدت کا کہیں وجود نہ تھا۔ راشٹرا کوٹ کے ہاتھوں **قنوج** تہس نہس ہو چکا تھا۔ **پنچال** کی بادشاہت ہمسایہ ریاستوں کے علاقہ کو دبا کر اپنی مقبوضات میں اضافہ کر رہی تھی۔ **چنڈال** کا راجہ **راجپال** سے نبرد آزما تھا۔ مسلمانوں کی فاتحانہ سیل کا سدِ باب کرنے کے لئے **پرتھوی راج** راجپوت حکمرانوں کا جتھا قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا جس میں سے **جے چند** کے غرور نے اُسے شرکت سے علٰحدہ رکھا۔ راٹھور اور **چوہان** ایک دوسرے سے برسرِ پرخاش تھے **کلاچوری** اپنی بالادستی کے فکر میں تھے جن سے **پسو ورمن** برسرِ پیکار تھے۔ **پارا** اور **آنارون** کا ہاتھ اپنے پڑوسیوں کے گلے پر تھا۔ **چنڈیلا**، **سونکی**، **چلوکیا**، **چولا**، **چیدی**، **کرالا**، **کرناٹکی**۔ سب کے سب ایک دوسرے کا کشت و خون کر رہے تھے۔ یہ ہے تاریخ اُن لاتناہی مناقشوں کی جو مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندوستان میں رونما تھیں۔

اس افراتفری میں جبکہ ہندوستان کی بے شمار ریاستیں ایک دوسرے کے خون کی پیاسی ہو رہی تھیں اور ان کے باشندے آپس میں علٰحدہ کٹ مر رہے تھے۔ مسلمان اخوت و رفاقت کے پیامبر بنکر نازل ہوئے۔ یہ بھی منجانب اللہ ایک تاریخی اتفاق تھا کہ جس خاندان نے سب سے پہلے ہندوستان کی زمام حکومت ہاتھ میں لی وہ غلام خاندان تھا اور دہلی کا پہلا بادشاہ خود غلام تھا۔ اس سے یہ زندہ جاوید سبق سکھانا تھا کہ جمہوریہ اسلام میں ایک غلام کو بھی ایک انسان کے پورے حقوق حاصل تھے اور وہ بھی بادشاہت کے منصب پر فائز ہو سکتا تھا۔ کچھ اور نہیں تو ایک ایسے ملک کے لئے جو ذات پات کی تفریق میں مبتلا تھا اسلام کا یہ پہلا سبق تھا۔

لیکن ابھی ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا آغاز ہی ہوا تھا کہ ملک کو ایک بیرونی خطرہ کا سامنا ہوا جو بروئے کار آجاتا تو ہندوستان کا سارا معاشرتی شیرازہ برہم ہو جاتا۔ ریگستانی گوبی سے تاتاریوں کا جو عام طور پر منگولی کہلاتے ہیں، خروج ہوا جنھوں نے جاپان سے جرمنی تک دنیا کو تہ و بالا کر دیا۔ اور چالیس سال کے مختصر زمانہ میں فضائے آسمانی اُن کی آتش زنی سے تیرہ و تار اور زمین معصوم مردوں، عورتوں اور بچوں کے خون سے رنگین ہو گئی۔ ایک مشہور مصنف نے کہا ہے کہ نزول ناگہاں، تباہ کاری، بے پناہ درندگی، خالی از جذبات و مقاصد سفاکی اور جہاں تک پوری بربریت کے ساتھ پھٹ پڑنے کا تعلق ہے تاتاریوں کی اس یلغار کی مثال (جن کے نام تک سے ان کے ہمسائے اس وقت تک ناآشنا تھے) انسانی تاریخ کے ایک منظر کے بجائے فطرت کی بعض بے پناہ ہولناکیوں سے دینا زیادہ موزوں ہوگا۔ ایک ایرانی مصنف نے اُن کے طور طریقوں کا ذکر ان مجمل الفاظ میں کیا ہے۔

"آمدند و کندند و سوختند و کشتند و بردند و رفتند"

[آئے، اکھاڑا، جلایا، مارا، لے گئے، اور چلے گئے]

پُرشوکت تمدنی بستیاں، مرفہ الحال بستیاں اور شہر دیکھتے دیکھتے جل کر خاک سیاہ ہو گئے اُن کی آگ خون سے بجھائی گئی اور لاکھوں انسان انتہائی درندگی کے ساتھ خاک میں ملا دیئے گئے۔

لیکن ہندوستان کا تمدن اور اس کی زندگی مامون و محفوظ رہی اور سلاطین دہلی کی زبردست کوششوں اور اعلیٰ فوجی تنظیم نے اس ملک کو تاتاریوں کی درندگی سے بچا لیا وہ تاتاری جنھوں نے چین، روس، پولینڈ، شام، ایران اور بہتیرے دوسرے ملکوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ امن چین کی فضا میں رہ کر تاریخ کا غلط تصور رکھنے والے بعض اوقات ابتدائی عہد کے مسلمان فرمانرواؤں کی سختیوں کے بارہ میں جو کچھ منہ میں آتا ہے کہہ گذرتے ہیں۔ ان کو چاہیئے کہ چشم تصور سے ذرا اُن دشواریوں کو بھی دیکھیں جو ہندوستان کو تاتاری یلغار سے محفوظ رکھنے میں التمش، ناصر الدین محمود، غیاث الدین بلبن اور علاؤ الدین خلجی کو اپنے تمام ذرائع اور وسائل کو برسرکار لانے میں پیش آئی ہوں گی بالخصوص جب ایک طرف ہندوستان کے دروازہ پر تاتاری مسلسل دستک دے رہے تھے اور دوسری طرف ملک کی اندرونی شورش و خلفشار کو فرو کرنے اور رکھنے کے فرائض سے بھی ان سلاطین کو عہدہ برآ

ہونا پڑتا تھا۔ جو لوگ تاریخ کے صحیح پس منظر سے منہ موڑ کر گفتگو کرنے کے عادی ہیں انھیں یہ حقیقت بھی ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ تاتاریوں کی اسی نسل کی سب سے اہم شاخ اسلام سے مشرف ہو کر ہندوستان میں داخل ہوتی ہے اور حکومت سنبھالتی ہے تو یہی وحشی، غارتگر، وحشی اور سفاک قوم اسلام کے اعتدال بخش تمدنی اثرات سے مستفید ہو کر آرٹ و ادب کی سب سے بڑی سرپرست بن جاتی ہے، جہاں تک ایک قوم کا دوسری قوم پر حکمراں ہونے کا تعلق ہے مغلوں کی حکومت آج بھی تاریخ کا سب سے روشن باب ہے۔

مسلمانوں کی آمد سے ہندوستان کو ایک مستقل سیاسی وجود اور ایک مستقل قومی ریاست کی تنظیم حاصل ہوئی، مسلمانوں نے ماضی کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینکا نہیں بلکہ اس ملک کو جوں کا توں ہندو استھان ہی رہنے دیا، ان کے مستقر حکومت دہلی، آگرہ، الہ آباد، لکھنؤ، حیدر آباد، گولکنڈہ، گوڑ اور متعدد دوسرے مقامات رہے لیکن ہر مقام پر وہ اقلیت ہی میں رہے۔

مسلمان بادشاہوں اور حکمرانوں کی سرپرستی میں ہندوستان کی ذہنی اور معاشرتی زندگی میں ایک نیا امتزاج بروئے کار آیا جس سے فنون و ادب، ریاضیات و طب، تعمیرات و انجینئرنگ میں ترقی ہونے لگی، سڑکیں، پل اور آبپاشی کی نہریں تعمیر ہوئیں، صنعت و حرفت اور تجارت کو انتہائی فروغ حاصل ہوا، صوبائی حدود توڑ دی گئیں، ملک کے نظم و نسق عدالتی اور مالی دونوں کی کلیتہً نئے سرے تنظیم کی گئی۔ مکتب اور مدرسے قائم کئے گئے اور ہر طبقہ و ہر مذہب کیلئے عام کر دئے گئے ہندوؤں کی مقدس کتابوں اور ہندوستان کے قدیم علمی و ادبی جواہر پاروں کا ترجمہ کیا گیا، تمام حکومت کی تفویض میں ذات یا مذہب کی کوئی تفریق جائز نہیں رکھی گئی، بڑے سے بڑے فوجی عہدے ہندوؤں کے ہاتھ میں تھے، سخت گیر عمال بلا لحاظ ملت و مشرب معزول کر دئے جاتے تھے۔ جاگیریں اور معافیاں مساجد اور مندروں دونوں کے لئے دی جاتی تھیں، تمام فرقوں کے اہل علم و فضل کی سرپرستی یکساں طور پر کی جاتی تھی۔ ہندوستان کی موجودہ حیثیت بہت کچھ ان کارناموں کی رہین منت ہے جو پہلے پہل مسلمانوں نے اس ملک میں پیش کئے۔

بدقسمتی سے موجودہ حالات و حوادث کی کشمکش میں لوگ اس تہذیبی ورثہ سے بہت کم آشنا رہ گئے ہیں اور اس کا بہت بڑا حصہ ان لامعلوم اور ناآشنائے تحقیقات

مخطوطات اور دستاویزوں میں سربستہ ہے جو دور دراز ملکوں مثلاً جرمنی، فرانس انگلستان اور امریکہ میں پوشیدہ پڑے ہیں جو مخطوطات اس ملک میں رہ گئے ہیں اُن کا مطالعہ بھی اب تک باقاعدہ اور مکمل طور پر نہیں ہوا ہے گو چند سال سے بعض فاضلوں نے جن میں ہندو مسلمان دونوں شامل ہیں یہ کام شروع کر دیا ہے، اور اس طور پر اسلام نے ہندوستان کی تاریخ تہذیب وتمدن میں جو اضافہ کیا ہے وہ عام لوگوں کی نظر کے سامنے آرہا ہے اور تاریخ ہند کے اسلامی باب کی تفسیر وتوضیح ہونے لگی ہے لیکن اس کثیر مواد کا لحاظ رکھتے ہوئے جو اب بھی ہندوستان میں دستیاب ہوسکتا ہے اور قطع نظر اُن دستاویزات کے جو یورپ اور امریکہ میں موجود ہیں کام کرنے والوں کی تعداد بدقسمتی سے بہت تھوڑی ہے۔

یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم کی ترقی کے باوجود مسلمان طلبہ اس بات کی کمی نہایت شدت سے محسوس کرتے ہیں کہ ہندوستانی یونیورسٹیوں کے دائرہ نصاب میں ان کو اپنے علمی وذہنی سرگرمیوں کو پورے طور پر برسرکار لانے کی بہت کم گنجائش نصیب ہوتی ہے۔ ایک مسلمان طالب علم کے بارہ میں یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ اس کے عام سائنٹفک یا فنی تربیت اچھی ہوجاتی ہے لیکن اسلام کی تمدنی برکات یا روایات یا تاریخ کے تار و پود میں ان کی اہمیت سے آشنا ہونے کے لئے جو مواقع ملنے چاہئیں ان سے وہ تقریباً محروم ہی رہتا ہے۔ اس سلسلہ میں اب تک جو تحقیقاتی کام ہوا ہے وہ بہت ہی قلیل ہے۔ مسلمان طالب علم کی تعلیم میں اس امر کا لحاظ رکھنے کی شدید ضرورت ہے کہ ترقی پذیر اور سائنٹفک خیالات سے بہرہ مند ہونے کے ساتھ ساتھ اُسے اسلام کے تخلیقی تصورات سے بھی آشنا ہونے اور برتنے کا موقع ملے۔

یہ خیال کرلینا کہ مسلمان طالب علم کی دلچسپی صرف عربی اور فارسی زبانوں کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے تک محدود ہو گزشتہ زمانہ کی بڑی فاحش غلطی تھی اس کے سامنے علم کی ایک بڑی وسیع مملکت ہے جو تنوع اور وسعت کے اعتبار سے اس کی ذہنی مناسبتوں سے متوازن کی جاسکتی ہے جس کی مکمل توضیح وتعبیر کے لئے سالہا سال کا عمیق مطالعہ وتحقیق درکار ہوگی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے اسلاف کے کارناموں کا ایک نہایت دلکش ورثہ بھی ملا ہے۔ اور ہم کو یہ فراموش نہ کرنا چاہئے کہ ہندوستان کے مستقبل کا انحصار اس کے موجودہ باشندوں کے اُن تہذیبی رجحانات کے عناصر ترکیبی کے ہم آہنگ کرنے اور بالآخر اس ذہنی وحدت پر ہے جو کل پروان ہوگی اور دلالت کرے گی۔ اس لئے تعلیمی پروگرام کو اس طرح مرتب کرنا چاہئے کہ اس میں ہندوستان کے تمام

تہذیبی سرچشموں کا تنقیدی مطالعہ شامل ہو۔ ملک کے مقاصد عمرانہ اور تعلیم کے مہمات اولیٰ کا سرانجام پانا ہندو مسلمانوں کے باہمی تعاون پر ہے۔ ایک دوسرے کے معتقدات کا احترام کرنا چاہیے اور اپنی تہذیبی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے پورے ہندوستان کو مربوط و متحد زندگی سے ہمکنار کرنے کا نصب العین پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اس سے اتفاق و یکجہتی کی روح پیدا ہوگی اور شر و فساد کا خاتمہ ہو جائے گا، اس طور پر نسلوں، تہذیبوں اور مذہبوں کا اختلاف ایک مشترک قومی نصب العین میں متوازن و مرکوز ہو جائے گا۔ میرا ایمان ہے کہ ہندوستان کے بہت سے حیران کن مسئلے اس طور پر طے پا جائیں گے۔ میں نے اپنے دل کی گہرائیوں میں یہ حقیقت ہمیشہ محسوس کی ہے کہ اس ملک کا تاریخی پس منظر جو کیف و کم دونوں اعتبار سے نہایت متنوع و پُرمایہ ہے اس صحت و خوبی سے مرتب کیا جا سکتا ہے کہ اس میں بسنے والی جتنی مختلف قومیں ہیں اُن میں ایسا وجدان و ولولہ پیدا ہو کہ وہ آپس میں شیر و شکر ہو جائیں،

عربی و فارسی کی تحصیل کے موجودہ مواقع کو برقرار رکھ کر یا انھیں مزید ترقی دیتے ہوئے ہندوستان کی ہر یونیورسٹی میں علوم اسلامیہ کی تنظیم ضمنی حیثیت سے نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں ہونی چاہیے۔ اور اس کی تعلیم کے لئے اس زبان کے علاوہ جس کا سیکھنا طالب علم کے لئے لازمی ہو کسی اور زبان کا جاننا ضروری نہ ہونا چاہیے۔ اگر ہمارے ہزاروں طلباء عربی و فارسی سے ناآشنائے محض رہ کر صرف انگریزی کے ذریعہ متعدد علوم و سائنس سے بہرہ مند ہو سکتے ہیں تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ عام طور پر کسی طالب علم کو اسلامی کلچر اور اس کی تاریخ کی تعلیم انگریزی یا آگے چل کر ہندوستان ہی کی ملکی زبانوں میں سے کسی ایک زبان میں کیوں نہیں دی جا سکتی جو طلبہ اس کے علاوہ عربی و فارسی کے مضامین اختیار کریں گے انھیں اعلیٰ علمی تحقیقات یا عمیق مطالعہ کرنے میں یقیناً بڑی سہولت ہوگی۔ لیکن عام طلبہ کے لئے یہ شرط لازمی نہ ہونی چاہیے۔ چنانچہ جب کلکتہ یونیورسٹی کی وائس چانسلری کی خدمت میرے سپرد ہوئی تو میں نے فوراً انھیں اصول کو مدنظر رکھ کر کلکتہ یونیورسٹی میں علوم اسلامیہ کی تنظیم کی ایک اسکیم پیش کی اور میں اس حقیقت کے اظہار میں بڑی خوشی محسوس کرتا ہوں کہ کلکتہ یونیورسٹی کے ہر فرد نے مجھ سے اس بارہ میں انتہائی ہمدردانہ تعاون کیا

اجازت ہو تو اس سلسلہ میں تاریخ کی ان درسی کتابوں کا ذکر بھی سرسری طور پر کر دوں جو ہندوستان کے تقریباً تمام صوبوں کے مدارس میں بچوں کو ایسی عمر میں پڑھائی جاتی ہیں جو حقیقتاً ان کی زندگی کی عمارت کی داغ بیل پڑنے کا زمانہ ہوتا ہے۔ ان کتابوں میں ہندوستان کی تاریخ بالخصوص

اس کے اسلامی باب کی مصوری ایسے رنگ میں کی جاتی ہے جس میں انتہائی غیر ہمدردانہ رنگ جھلکتا ہے۔ مثلاً سلطان محمود آیا لوٹ مار کی اور ہندوستان کے مندروں کو برباد کر گیا۔ بلبن ظالم و جابر تھا۔ علاء الدین کا رویہ چتوڑ کی مہم میں وحشیانہ تھا۔ محمد تغلق مجنون و جابر تھا۔ جہانگیر عیش پرست تھا۔ اور اورنگ زیب بت شکن تھا۔ اس نے یک قلم تمام ہندو مندروں کو مسمار کر دینے کا حکم دے دیا۔ یہ ہے تاریخ کا وہ پس منظر جو ہمارے اسکول کے بچوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ کچھ دن ہوئے ایک ممتاز مورخ نے یہ رائے دی تھی کہ چند مقامات پر تاریخ کی درسی کتابیں اس نہج پر لکھی جائیں کہ ان سے ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا بہتر پس منظر مرتب ہو سکے، اس امر کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ تاریخ کی تعلیم کا اصل مقصد کسی ملک کا صحیح پس منظر پیش کرنا ہوتا ہے۔ اس سے نوجوانوں کے دل و دماغ وطن اور اہل وطن کی الفت سے شاداب و سرشار ہوتے ہیں تاریخ کے ابواب سے ناگوار اور تلخ ناک داستانوں کو محو کرنا کسی کا مقصد نہیں ہوتا۔ اگر وہ ہیں تو رہیں گے اور لوگ ان سے سبق سیکھیں گے تاوقتیکہ ہمارا سابقہ کسی "ہمہ مسلط" مملکت سے نہ ہو پھر یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اسکول کی درسی کتاب میں ڈیڑھ دو سو صفحے ہوتے ہیں لیکن دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا مورخ ہوگا جو ہندوستان جیسے وسیع ملک کی دو ہزار سال کی انسانی سرگرمیوں کی تاریخ بہت سے واقعات کو حذف کیے بغیر تمام جزئیات کے ساتھ مرتب کر سکتا ہو۔ چند ہی سال ہوئے مجلس اقوام نے سفارش کی تھی کہ قوموں اور نسلوں کی تاریخ ایسی لکھنی چاہیے بالخصوص ان طلبا کے لئے جو زندگی کے تشکیلی دور میں ہوتے ہیں، جن سے باہمی حسد و نفرت کا جذبہ پیدا ہونے کے بجائے محبت و اخوت کا جذبہ پیدا ہو۔ ہم کو حقیقت نظر انداز نہ کرنی چاہیے کہ ہندوستان کے مختلف فرقوں میں آج جو کشیدگی پائی جاتی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ تاریخ کا نہایت غلط پس منظر پیش کیا گیا ہے۔ اور میں یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ کسی ایک فرقہ کے سود و بہبود کا ملحوظ رکھ کر نہیں بلکہ سارے ہندوستان کی اصلاح و فلاح کو مد نظر رکھ کر کہہ رہا ہوں۔ ہونا یہ چاہیے کہ دونوں فرقوں کے طلبا میں ایک دوسرے کے زمانہ نسل یا تہذیب کا واضح شعور غیر محسوس طور پر پیدا ہو اور رفتہ رفتہ ان میں ایک دوسرے کے ماضی سے ہمدردی پیدا ہونے کی صلاحیت پیدا ہو۔ یہ ہے تاریخی احساس کی اصل بنیاد۔ ہم کو طالب علم کے اندر ہمدردی کا رخ پیدا کرنی ہے۔ ہندوستان اور اس کے اداروں نیز اس کی معاشرتی و سیاسی ترقیوں سے دلچسپی کرانی ہے اور اسے خاندانوں، نسلوں، سوسائٹی اور تحریکوں کے انقلابات سے

آشنا کرانا ہے۔ انجام کار بچہ کو آہستہ آہستہ ایسی تربیت دینی ہوگی کہ وہ سلطنت ہند کا اچھا شہری بن سکے۔ اپنے ملک کی تاریخ سے ولولہ اور مسرت حاصل کر سکے۔ اپنے وطن کے بھائیوں پر جان چھڑکے اور جن لوگوں نے ہندوستان کی تاریخ تعمیر کی ہے انہیں اچھا سمجھے۔ اُسے ماضی سے حقیقی اُنس ہونا چاہئے اور ان تمام درمیانی منازل سے بھی جن سے ماضی جمیل نے حال کو گزار کر ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ وہ وقت آگیا ہے کہ حال سے جھگڑنے کے بجائے ہم یہ محسوس کریں کہ ہمیں اس ذی مرتبت ملک کے لئے ایک مستقبل تعمیر کرنا ہے بدنصیبی سے ہم پر ایسا وقت آگیا ہے کہ گرد و پیش کی ہر چیز اکھڑی، اور الجھی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور لوگ اس کے درپے ہیں کہ شاندار ماضی کو بالکل نظر انداز کر دیں۔

گزشتہ زمانہ میں ہم نے بڑے بڑے جھٹکے کھائے۔ فارسی عدالتی زبان کی حیثیت سے منسوخ کر دی گئی یہ ایک نیا مسئلہ تھا جس کے جھٹکے کو ہم نے سہہ لیا۔ حکومت کے نئے دروبست جن مطالبات پر منحصر ہوتے تھے ان سے بھی ہم نے اپنے آپ کو متوازن کر لیا۔ ہم اُس نئے نظام تعلیم کے بھی خوگر ہو چکے ہیں جو اس وقت ملک میں نافذ ہے۔ لیکن جس تازہ ترین حادثہ سے آج ہم ہندوستان میں دوچار ہیں وہ یہ ہے کہ اردو کو جو عام طور پر ہندوستانی کہتے ہیں جبراً معزول کیا جا رہا ہے زبان ہندوستان میں اسلامی حکومت کی گرانمایہ ترین عطیات میں سے ہے اور ہر جماعت میں کے لاکھوں آدمیوں کا وسیلہ اظہار خیال بنی ہوئی ہے اور ہندو مسلمان دونوں کا عظیم الشان ترکہ مشترک ہے زبان کو یکسر منقلب کر دینے کا یہی طریقہ بنگالی زبان کی تاریخ میں بھی اختیار کیا گیا تھا۔ لیکن وہاں یہ بات عمداً اختیار نہیں کی گئی تھی بلکہ بعض ناگہانی حالات و حادثات کا ایک ناگزیر نتیجہ تھی۔ بنگالی زبان و ادب نے بنگال کے مسلمان فرمانرواؤں کے درباروں میں نشو و نما پائی۔ بنگال کے قدیم ادبی خزانوں میں مسلمان مصنفین کے نام ملتے ہیں۔ انیسویں صدی کے ابتدا تک یہ زبان الفاظ اسلوب بیان اور خیالات کے اضافوں سے جو مختلف سرچشموں سے آئے تھے مالا مال ہوتی رہی لیکن غدر کے خاتمہ پر صورت حال کچھ ایسی ہوئی کہ کچھ دنوں کے لئے مسلمان کہیں کے نہ رہے۔ اس کے بعد جن لوگوں نے اس زبان کو فروغ دیا انھوں نے قدرتاً زبان کو ان سرچشموں سے سیراب کیا جو ان کے لئے سہل الحصول تھے۔ لیکن اس کے بعد جو ادب سامنے آیا اس کی زبان نحویوں اور فرہنگ نویسوں کی تھی عام لوگوں کی نہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بنگالی زبان و ادب نے فطری طور پر ایسا آب و رنگ اختیار کر لیا کہ مسلمانوں کے لئے اس میں اسلامی خیالات جذبات یا اسامیہ سے آشنا ہونے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی۔ خوش قسمتی سے چند ممتاز اہل علم نے اس رَو کا فوراً

ہی سدِ باب کر دیا اور اپنی پیش بینی سے اس حقیقت کو سمجھ لیا کہ کسی قوم کے ادب کو اس کی زبان اور ضروریات سے علیحدہ کر دینا اس ادب کے لیے کس درجہ خطرناک تھا ہندو مسلمان اہلِ قلم کے شمول سے آج بنگالی زبان محکم تر نظر آتی ہے۔ لیکن یہ واقعہ اپنی جگہ پر ہے کہ چند سال قبل تک ایک مسلمان کے لئے بنگالی ادب کے ذریعہ اپنی روحانی اور تہذیبی مطالبات سے آشنا ہونا ناممکن تھا مجھے پورا یقین ہے کہ وہ وقت دور نہیں جب بنگالی زبان جو آج ہندوستان کی بڑی زرخیز زبانوں میں ہے مسلمان مصنفین کے شمول سے جو اسے اپنی ادبی سرگرمیوں کا وسیلہ بنائیں گے زندہ تر اور قوی تر ہو جائے گی۔"

لیکن اس صوبہ میں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ یہاں کی زبان وادب کو زیادہ دنوں تک مسلمانوں کے فیضان وافتادِ ذہنی سے علیحدہ نہیں رکھا جا سکتا اور اسے مسلمانوں کی برگزیدہ روحانی و مذہبی مقتضیات کا حامل بننا پڑے گا۔

اس کے برخلاف اکثر صوبوں میں جہاں اردو وسیلہ اظہارِ خیال ہے مسلمان اقلیت میں ہیں اگر وہاں حکومت یا انتظامی دروبست کے ماتحت واقعات نے پلٹا کھایا تو وہ دن لازمی طور پر آکر رہے گا جب بنگال کی طرح وہاں کے مسلمانوں کو بھی اپنے تمدنی افکار وتصورات کو بروئے کار لانے میں سخت رکاوٹوں کا سامنا ہوگا' اگر عام حالات کے ماتحت کسی زبان میں عہدِ جدید کے مطالبات کا لحاظ کر کے بدیسی یا اجنبی الفاظ کی قلمکاری ہو جائے تو مجھے کوئی شکایت نہ ہوگی۔ الفاظ وفقروں کی روانی کے اعتبار سے انگریزی زبان دنیا کے تمام دوسری زبانوں سے زیادہ بہرہ مند ہے۔ لیکن فرض کر لیجئے کسی کے ذہن میں یہ بات سما جائے کہ اس میں یونانی لاطینی' یا جرمن' الفاظ کو دیدہ ودانستہ شامل کرنا چاہیے تو یہ ایسی ہی متشدد کارروائی ہوگی جتنی کہ اردو زبان کی صورت وسیرت بدل دینے کا موجودہ رجحان ہے۔"

ہندوستان کے باشندوں کے ذہن ودماغ پر اردو جس طرح اثر انداز ہے اس کو کمزور کرنے کی دیدہ ودانستہ کوئی کوشش کی گئی تو اس سے مسلمانانِ ہند کے کلچر کو بڑا دھچکا پہنچے گا کیونکہ اس زبان کو موجودہ شکل تک ترقی دینے میں ہندو مسلمان دونوں نے برابر کی کوشش کی ہے کچھ روز ہوئے میں الہ آباد کی ایک مجلس میں شریک تھا جہاں چند ہندو اہلِ علم اس مسئلہ پر بحث کر رہے تھے۔ نئی ہندوستانی کے لباس میں صوبہ کی ایک حکومت نے حال ہی ایک گشتی مراسلہ شائع کیا تھا جو پڑھ کر سنایا گیا۔ میں بلا تامل عرض کرتا ہوں کہ ان ہندو فاضلوں میں سے

ایک بھی اس مراسلہ کا مفہوم پورے طور پر نہ سمجھ سکا۔ میں نے اپنے اسکول کے زمانہ میں تھوڑی سی سنسکرت پڑھی تھی اس لئے کئی مقام پر میں اس کے مفہوم کو ان سے بہتر طور پر واضح کر سکا اگر اظہار مطالب کا یہی اسلوب اردو بولنے والوں کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ دن دور نہیں جب اس کا انجام تباہی کے سوا اور کچھ نہ ہوگا اور یہ روش ملک کے مستقبل کے لئے نہایت تکلیف دہ ہوگی۔

۲ اردو ہندوستان کی نہایت ترقی پذیر زبانوں میں ہے۔ والا شان ہز اگزالٹڈ ہائینس نظام آف حیدر آباد کی مؤقر رہبری میں یہ ہندوستان میں یونیورسٹی کی اعلیٰ ترین تعلیم کا وسیلہ بن چکی ہے سائنٹیفک اور فنی اصطلاحات کی ایک ضخیم فرہنگ اس طرح اس زبان کا جز بن چکی ہے کہ اصطلاحات کا مفہوم آسانی سے ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ گزشتہ برسوں اس قسم کا کام علی گڑھ میں بھی ہو چکا ہے اردو کو ایک عام مشترک زبان کی حیثیت سے سارے ہندوستان میں سب سے زیادہ مقبول عام نصیب ہے۔ یہ تمدنی رشتہ ہے جس نے ہم کو ماضی سے وابستہ و پیوستہ کر رکھا ہے اس لئے ہم کو یہ گوارا نہیں ہو سکتا کہ اس کے ساتھ دست درازی کی جائے ہمیں اس کے ادب اسکے خزانوں اور اس کی آئندہ ترقی کو ہر قسم کے تشدد سے بچانا اور محفوظ رکھنا ہے۔

میں نے اکثر اپنے دل کی گہرائیوں میں یہ بات محسوس کی ہے کہ بنگال میں ہمارے لئے غالباً بہتر ہوگا کہ ہمارے طلبا کم سے کم وہ جو عربی فارسی کی اعلیٰ التعلیم نہیں حاصل کرنا چاہتے ثانوی زبان کی حیثیت سے اردو سیکھنا پڑھا کریں۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں کبھی بھی اس بات کو گوارا کرونگا کہ بنگال کے مسلمانوں کی مادری زبان اردو ہو جائے کلکتہ، ڈھاکہ، مرشد آباد ایسے چند مقامات کے علاوہ بنگالی مسلمانوں کی مادری زبان بنگالی ہی ہے اور ہمارے امید و دلولوں کی ترجمانی لازمی طور پر یہی زبان کرے گی لیکن اگر ایک ثانوی زبان سیکھنی ہی ہے بالخصوص میٹرک کے نصاب میں جہاں ثانوی زبان کی حیثیت لازمی مضمون کی ہے تو میں اردو کو دوسری زبانوں پر ترجیح دونگا اس سے مسلمانان بنگال کا تمدنی رابطہ دوسرے صوبوں اور میرونجات سے قائم ہو جائے گا۔ میں امید کرتا ہوں میری اس بات سے کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہوگی۔ میں عربی کی تعلیم میں جو ہماری مذہبی اغراض و مقاصد کے لئے از بس ضروری ہے کسی طرح کی رکاوٹ نہیں پیدا کرنا چاہتا نہ میں کسی طالب علم کو جو عربی زبان و ادب کی اعلیٰ التعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے عربی پڑھنے سے روکتا ہوں میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ ہمارے بڑے بڑے مدرسوں میں عربی و فارسی کی جو اعلیٰ التعلیم دی جاتی

ہے وہ کسی صورت میں بھی موقوف کی جائے۔ میں صرف ان کثیر التعداد عام طلبار کے بارہ میں کہتا ہوں، جو اس زبان کو میٹریکولیشن کورس کے بعد فوراً ہی ترک کر دیتے ہیں، ان کے لئے غالباً یہ بہتر ہوگا کہ وہ اُردو کو بطور ثانوی زبان کے حاصل کریں اس طرح انکا رابطہ ہندوستان کی ایک ایسی زندہ زبان سے قائم ہو جائے گا جو روز بروز ترقی کر رہی ہے، گو قوت اور وسعت کے جن مراتب پر وہ آج فائز ہے اس سے محروم کر دینے کی بیہودہ کوششیں بھی جاری ہیں۔

آخر میں چند الفاظ میں ان لوگوں سے بھی کہنا چاہتا ہوں جو پندار و تجبر کے غلبہ میں یہ بات بالعموم فراموش کر جاتے ہیں کہ دنیا میں نیشلزم (ملت دوستی) کی ارتقا و ترقی میں اسلام نے کتنا بڑا حصہ لیا ہے۔ فطرۃً اسلام ملت دوستی کو تاریخ انسانی کا انتہائی نصب العین نہیں قرار دیتا۔ اسلام کا بلند ترین نصب العین، انسانوں کی جمہوریت، قوموں کی برادری اور بین الاقوامی یکجہتی رہا ہے۔ تاہم فوری و ابتدائی مقصد کے اعتبار سے ملت دوستی کو ہمیشہ تسلیم کیا گیا ہے، اور تاریخ کے صفحات میں وہ ناموران اسلام جنھوں نے اپنے وطن کے لئے بے تامل اپنی جانیں قربان کی ہیں ہمیشہ مراتب جلیلہ پر فائز رہیں گے۔ تاریخ ہند کے اوراق میں ناموران اسلام کے نام اور کارنامے زریں حروف میں ملیں گے جو نہ مٹے ہیں نہ مٹائے جاسکیں گے، ہندوستان کے میدان، کوہستان اور وادیاں ان کے بلند و برگزیدہ کارناموں کی داستان دھراتی اور برابر دھراتی رہتی ہیں، میں نہایت وثوق اور ذمہ داری کے پورے احساس کے ساتھ کہتا ہوں کہ ایک مسلمان کو اس کے احساس وطن دوستی سے جدا کر دینے کی کوشش ویسی ہی لایعنی و دور از کار ہے جیسی اس کو اس کے خدا، مذہب یا اس کے اس نصب العین سے جدا کرنے کی کوشش کہ پایان کار انسان، انسانیت کے رشتہ میں منسلک ہو کر رہے گا، ہر مسلمان نفس واپسیں تک وطن کا دوست ہے اس کے خلاف کچھ کہنا بعید از فطرت ہی نہیں بلکہ مسلمانوں پر ایک بہتان عظیم ہے، ہم ہندوستان ہی کو اپنا مولد و منشار سمجھتے ہیں اور یہ میں ان لوگوں کے علی الرغم کہتا ہوں جو ہمارے ساتھ وہ سلوک کرنے میں تامل نہیں کرتے جو مہمانوں یا پردیسیوں سے کیا جاتا ہے، ہم ہندوستانی ہیں اور ہندوستان ہی کی آب و گل سے اُٹھے ہیں۔ بالکل انہی لوگوں کی طرح جو وسط ایشیا کے ممالک سے نوع انسانی کے سیل رواں کے ساتھ یہاں آئے اصلی باشندوں کو پہاڑوں

اور جنگلوں میں مار بھگایا اور اس ملک کو اپنا لیا۔

ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ موجودہ تہذیب کی ابجد ہی اسلامی تعلیمات و تمدنی کارناموں کے اُن نقوش سے شروع ہوتی ہے جو افکار جدیدہ کی تاریخ پر ثبت ہیں مساوات کے اصولوں کو تسلیم کرنا اور ان کی حمایت کرنا اسلامی نصب العین اور اسلامی پیش نہاد کی بنیادی خصوصیت رہی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ابتدا ہی سے اسلام کا طریق عمل جمہوریت کاری رہا ہے اور اسلام اور اس کے رسول نے ہمیشہ جمہوری اصولوں کی تلقین کی ہے اور جمہوریت کو روابط انسانی کی بنیاد قرار دیا ہے۔ انھیں اصول کو برقرار رکھنے اور ان کی حفاظت کرنے میں دنیا کو انقلابات اور حرب و ضرب کی کیسی کیسی حشر انگیزیوں کا سامنا رہا ہے۔ پھر دیکھیئے انسانی آزادی کی ان مباویات مہمہ کو منوانے کے لئے جو رستخیز برپا ہے وہ آج تک فرو ہونے کو نہیں آیا؟ دوسری طرف اب سے صدیوں پہلے جب افکار انسانی سے ان کا تخیل کلیتہً ناپید تھا۔ اسلام نے ان کی حرمت عظیم کا اعلان دنیا کے سامنے کیا۔ اسلام نے صاف صاف لفظوں میں یہ کہدیا کہ مسلمان نہ صرف آپس میں برابر تھے بلکہ خدا کی نظر میں بھی یکساں تھے، اسلام کے رسول نے ارشاد فرمایا "نہ سفید آدمی کو کالے آدمی پر فضیلت ہے اور نہ کالے آدمی کو پیلے آدمی پر، ہر انسان اپنے خالق کی نظر میں یکساں درجہ رکھتا ہے، ان اصولوں کے سامنے سلطانوں اور شہریاروں کو سر تسلیم خم کرنا پڑا،

اس عقیدے نے کہ ہر شخص خدا اور قانون کے نزدیک یکساں حیثیت رکھتا ہے تمام دنیا کے مسلمانوں کو اس جمہوریہ افراد میں شامل کردیا ہے جس پر خدا کی فرمانفرمائی قطعی بلا واسطہ اور مکمل ہے ایک لمحہ کے لئے توقف کرکے میں اس موقع پر یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ہماری اس وسیع دنیا میں مساوات کی اس سے بہتر و برتر تعریف کہیں اور کی گئی اور انسانی آزادی کے اس سے زیادہ قطعی و مختتم نصب العین کی پیروی کی گئی؟

مساوات اور جمہوریت کے انھیں اصول کے پیچھے صدیوں سے یہ دنیا سرگرداں بھی ہے اور دست و گریباں بھی یورپ سے اسلام کے اثرات ختم ہونا تھا کہ انسانی افکار میں ایک انقلاب عظیم برپا ہوگیا جو اصول جمہوریت کے لئے سنگ آمد و سخت آمد کا مصداق بنا جمہوری نصب العین کے خلاف شدید ردعمل برسرکار آیا۔ جمہوریت کی جگہ استبدادی چنگیزی اور ان کی مماثل حکومتوں نے لے لی لیکن جمہوریت کی روح فنا نہ ہوسکی۔ گزشتہ دو صدیوں

سے جمہوریت کا ایک نیا دور شروع ہوا ہے، جو انسانی زندگی کے بدلتے ہوئے حالات کے مناسب ہے، یہ دعوے کیا گیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ ہر شخص اس سے بلا تامل اتفاق کرے گا کہ تصورات عالیہ کے اس ارتقا میں اسلامی تعلیمات نے بڑی سہولتیں بہم پہنچائی ہیں آج دنیا کے بعض ممالک میں آمریت کی متکبرانہ جلالت مآبیوں سے جمہوری حکومت کی روشنی ماند پڑ گئی ہے لیکن مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ یہ صورت حال صرف عارضی ہے انجام کار جمہوریت ہی کی طاقتوں کو فتح نصیب ہو گی، اس وجہ سے اور بھی کہ جمہوریت کو دنیا کے کروڑوں مسلمانوں کو حقیقی رفاقت وحمایت حاصل ہے جو اسلامی قانون کے اقتدار مطلق کو تسلیم کرتے ہیں۔ وہ دن زیادہ دور نہیں ہے جب جمہوریت آزادی اور مساوات کے ملبوسات فاخرہ سے مزین ان بادلوں کو چیر کر نمودار ہو گی جو آج دنیا کی ظلمتوں میں اضافہ کر رہے ہیں اور جب وہ یوم اکبر آئے گا تو وہ اسلام ہی کی روح ہو گی جو ایک بار پھر دنیا کو جور وجبر کے شکنجہ سے آزادی دے گی، لیکن انسانی معاملات ومشاغل کے اس نظام میں کسی ایسے دخانی جسیم وجامد جمہوری بیلن کا کوئی دخل نہ ہو گا جو اقلیتوں کے تہذیبی، سیاسی اور معاشرتی حقوق کو خاطر میں نہ لائے۔ کیونکہ یہ جمہوریت روح اسلام سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔ اسلام سب کے لئے عدل چاہتا ہے سب کے ساتھ مساوات برتنے کا حامی ہے اور ہر ایک کو ہار جیت کا یکساں موقع دینے کا علمبردار ہے، بنظر براں حکومت جمہوری ہو یا کوئی اور اگر وہ اقلیتوں کے ان بنیادی حقوق کی کافی اور موثر طریقہ پر ضمانت نہیں کرتی تو اسلامی دائرہ تصور میں اس کا کوئی مقام نہیں!

خطبہ کے بعد محمد ہارون خاں صاحب شروانی پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن نے حسب ذیل رزولیوشن پیش کیا،

رزولیوشن نمبر ۱

وہ یہ کانفرنس ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے ارباب حل وعقد سے استدعا کرتی ہے کہ اپنے یہاں تاریخ وتمدن اسلامی کے شعبہ جات قائم کریں یہ کانفرنس خان بہادر عزیز الحق صاحب وائس چانسلر کلکتہ یونیورسٹی کے اُن

مساعی کی دل سے قدر کرتی ہے جو انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی میں ایسا
شعبہ قائم کرانے کے لئے کی ہیں"

مندرجہ بالا رزولیوشن پیش کرتے ہوئے پروفیسر محمد ہارون خان صاحب نے فرمایا کہ ہندوستان میں ایسی یونیورسٹیاں موجود ہیں جن کے ماتحت لاکھوں مسلمان تعلیم پا رہے ہیں اسلئے یہ ضروری ہے کہ تاریخ اسلام کی تعلیم کا انتظام بھی کیا جائے بعض یونیورسٹیوں مثلاً "جامعہ عثمانیہ" میں ایک خاص شعبہ دینیات کا ہے نیز علی گڑھ یونیورسٹی میں تاریخ اسلام، تاریخ فلسفہ اسلام اور دینیات کی تعلیم کا انتظام ہے، کوئی وجہ نہیں کہ دوسری یونیورسٹیوں میں بھی انتظام نہ کیا جائے اسی سلسلہ میں آپ نے وائس چانسلر صاحب کلکتہ یونیورسٹی کی خدمات کا اعتراف کیا کہ ممدوح نے اس طرف توجہ فرمائی ہے"

پروفیسر عبدالقادر صاحب (اسلامیہ کالج پشاور) نے اس رزولیوشن کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ اگر اسلامی تمدن و تاریخ کے محفوظ رکھنے کی کوشش نہ کی گئی تو مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہو جائے گی اسلامی تہذیب و تمدن ہی ایک ایسی چیز ہے جس نے دنیا کے سب مسلمانوں کو ایک دوسرے سے مانوس کر دیا ہے آج مراکش کا ایک مسلمان جب "السلام علیکم" کہتا ہے تو ہم فوراً اس سے مانوس ہو جاتے ہیں اور کسی قسم کی بیگانگی محسوس نہیں کرتے ہیں ہزار بارہ میل کا سفر کر کے پشاور سے کلکتہ آیا ہوں لیکن آپ لوگوں سے کچھ بھی مغائرت یا اجنبیت محسوس نہیں کرتا یہ اسلامی تمدن کی خوبی ہے ہندوستان کی خواہ کوئی یونیورسٹی ہو اس میں ہمارا ضرور حصہ ہے جس طرح ہم مسلمان ہیں اسی طرح ہندوستانی بھی ہیں، سلسلہ تقریر میں لائق مولانا نے آنریبل عزیزالحق صاحب کے خطبہ صدارت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اس میں وہ "روح" موجود تھی جو مسلمانوں کی تقریروں میں عام طور پر نہیں پائی جاتی، اس تائیدی تقریر کے بعد رزولیوشن بالاتفاق منظور ہوا"

مندرجہ بالا رزولیوشن منظور ہونے کے بعد ڈاکٹر عبدالعزیز پوری صاحب نے حسب ذیل رزولیوشن پیش کیا"

رزولیوشن نمبر ۲

"اسلامی تاریخ" "فلسفہ" اور "تمدن کے مضامین [illegible] امتحان میں شامل

کرنے پر یہ کانفرنس گورنمنٹ بنگال کو مبارکباد دیتی ہے نیز گورنمنٹ آف انڈیا اور مختلف صوبوں کی دوسری گورنمنٹوں سے بھی یہ کانفرنس درخواست کرتی ہے کہ وہ ان مضامین کو اپنے اپنے یہاں مقابلہ کے امتحانوں میں شامل کریں"

یہ رزولیوشن پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالعزیز پوری نے اس بات پر اظہار مسرت کیا کہ آنریبل فضل الحق صاحب کے عہد میں صوبہ بنگال میں اس پر توجہ کی گئی،

اس کے بعد مسٹر سید حسین برنی (علیگ) ایڈووکیٹ بلند شہر نے اس رزولیوشن کی تائید کرتے ہوئے فرمایا کہ انگریزوں نے ہماری تاریخ کو بالکل مسخ کر دیا ہے اس لئے ضرورت ہے کہ اس بارہ میں منظم و باقاعدہ کوشش کی جائے لہذا میں اس رزولیوشن کی تائید کرتا ہوں،

اس کے بعد خان بہادر مرزا ابو جعفر صاحب نے حسب ذیل رزولیوشن پیش کیا

رزولیوشن نمبر ۳

"اس کانفرنس کی رائے میں یہ ضروری ہے کہ مسلمان لڑکوں کے لئے ابتدائی اور ثانوی تعلیم میں مذہبی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے"

مرزا صاحب نے اس رزولیوشن کو پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ مسلمانوں کے نقطہ نظر سے مذہبی تعلیم اس قدر ضروری ہے کہ وہ اپنے بچوں کا دوسری چیزوں سے بے علم رہنا تو پسند کر سکتے ہیں لیکن یہ نہیں گوارا کر سکتے کہ وہ مذہب سے بالکل ناواقف رہ جائیں، اگر مسلمان بچہ اپنے مذہب سے ناواقف ہو تو یہ اس کی بہت بڑی محرومی ہے، اکبر الہ آبادی نے سچ کہا ہے،

مدعی کہتا ہے کیا پروا ہے گر مذہب گیا
میں یہ کہتا ہوں کہ بھائی یہ گیا تو سب گیا

لہذا مسلمان بچوں کے نصاب تعلیم میں مذہبی تعلیم کو بطور ایک ضروری جزو کے داخل ہونا چاہیئے

مولوی عبد الحامد صاحب قادری بدایونی نے اس رزولیوشن کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ بچپن میں جو نقوش بچوں کے دل میں قائم ہو جاتے ہیں وہ ہمیشہ باقی رہتے ہیں، اس لیے یہ ضروری ہے کہ بچپن ہی سے [illegible] تعلیم کا انتظام کیا جائے، تحریک و تائید کے بعد رزولیشن

بالاتفاق پاس ہوا۔

مندرجہ بالا تقریر کے بعد خاکسار آنریری سکرٹری نے آنریبل عزیز الحق صاحب کے خطبہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ جب میں نے یہ خطبہ سنا تو محسوس کیا کہ ایسے خطبہ پر صدر صاحب کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے کانفرنس میں گزشتہ پچاس سال کے زمانہ میں بہت کم ایسی تقریریں ہوئی ہیں، مجھے حیرت ہے کہ انھوں نے کیسی خوبی و قابلیت کے ساتھ یہ خطبہ لکھا ہے اور کیسی جرأت سے پیش کیا ہے، خدا تعالیٰ سے میری یہ دعا ہے کہ ان کو مزید توفیق عطا کرے اور وہ حق کے اظہار میں اسی طرح آئندہ بھی جرأت سے کام لیں۔

خاکسار آنریری سکرٹری کے مندرجہ بالا مختصر ریمارک کے بعد سہ پہر کا اجلاس ختم ہوا اور یہ اعلان کیا گیا کہ رات کو عام اجلاس ہوگا۔

دوسرا اجلاس عام

۲۹۔ دسمبر ۱۹۳۹ء بوقت ۸ ½ بجے شب

سہ پہر کے اجلاس کے بعد ۸ ½ بجے رات کو کانفرنس کا دوسرا اجلاس عام زیر صدارت نواب کمال یار جنگ بہادر شروع ہوا سب سے پہلے منشی ثروت اللہ صاحب نے کلام مجید کی تلاوت کی اس کے بعد پروفیسر محمد صدیقی ایم اے نے حسب ذیل قومی نظم پڑھی،

خستگی میں پاس غم ہائے نہاں کرتے ہوئے
اپنی خاموشی کو عنوان بیاں کرتے ہوئے

ایک زمانہ ہو گیا ضبط فغاں کرتے ہوئے
اور اس ضبط فغاں کا امتحاں کرتے ہوئے

پر نہیں نکلی کوئی صورت علاج درد کی
کالعدم دیکھی گئی تاثیر آہ سرد کی

حد سے افزوں ہو گئی ہر چند نکبت قوم کی
پر سوا ہوتی گئی ہر لحظہ غفلت قوم کی

کتنے ہی لوگوں نے جب دیکھی یہ حالت قوم کی
ہو گئے ہم سے الگ کہہ کر کہ قسمت قوم کی

جو ذرائع تھے ترقی کے مٹے وہ یک قلم
پر ہمیں دیکھو کہ ہوتے ہیں نہیں مایوس ہم

گو پریشانی بڑھی آشفتہ سامانی بڑھی
کاہش جانی بڑھی تکلیف روحانی بڑھی

اور جنونِ غم فزا سے چاک دامانی بڑھی
چاک دامانی بڑھی تو خانہ ویرانی بڑھی

اس پہ بھی تعمیر قومی سے نہ ہم غافل رہے
گو یہ ظاہر ہے شکارِ دوری منزل رہے

متحد ہونے لگی ہر قوم طاقت کے لئے
متفق ہونے لگا ہر ملک عظمت کے لئے

منتشر جو تھے وہ سمٹے ہیں محبت کے لئے
اور ہم روتے ہیں پچھلی شان و شوکت کے لئے

شکوۂ جور فلک ہے اور عمل کوئی نہیں
سچ تو یہ ہے شیوہ ایسا مبتذل کوئی نہیں

کس لئے آہ و بکا و شیون و ماتم کریں
کس لئے فریاد سے ہم انجمن برہم کریں

ہو چکی جو ہم سے غفلت اس کا اب کیا غم کریں
آؤ اب سب مل کے یکجا کوشش پیہم کریں

لذتِ محنت سے جب دل آشنا ہو جائیگا
دور راحت اپنا دور ابتلا ہو جائیگا

ریگ میں ہم کو نظر آئے گی دولت کی بہار
خاک میں ہم کو دکھائی دے گی ثروت کی بہار

یہ جو پستی ہے وہ بن جائیگی رفعت کی بہار — یہ جو نکبت ہے وہ ہو جائیگی رحمت کی بہار
گل بداماں ہوں گے ہم شاداب ہوگا یہ چمن — یہ چمن کہتے ہیں عرفِ عام میں جس کو وطن

نظم کے بعد آنریبل ڈاکٹر سر شاہ سلیمان صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی نے مسلمانوں میں "اعلیٰ صنعتی تعلیم کی ضرورت" پر ایک تقریر فرمائی جس کا ملخص حسب ذیل ہے۔

جناب صدر و حضرات! علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا صنعتی شعبہ سب سے چھوٹا اور سب شعبوں کے مقابلہ میں نامکمل ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس کے تفصیلی حالات بیان کرنا کچھ مفید نہ ہوگا۔

حضرات! ۱۸۷۵ء میں جب سر سید مرحوم نے مسلمانوں کو گرفتار جہالت پاکر کالج کی بنیاد ڈالی تو اُن کے ذہن میں یہ بات تھی کہ علی گڑھ ایک اعلیٰ درسگاہ اور مذہبی مرکز بن جائے۔ اُس وقت یہ درسگاہ ایک اسکول کی صورت میں تھی لیکن سر سید نے اپنی زندگی میں اس کو کالج کی شکل میں بھی دیکھ لیا۔ یہ سر سید کی دور اندیشی کا نتیجہ ہے کہ اب اس چھوٹے سے اسکول کی جگہ پر ایک عظیم الشان یونیورسٹی ہے، جہاں ہندوستان کے ہندو و مسلمان بچے تعلیم پاتے ہیں بلکہ برہما، رنگون اور افغانستان تک کے طلبہ آتے ہیں۔ یہ یونیورسٹی ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے باعث فخر اور تمام اسلامی دنیا میں ممتاز ہے۔ ہماری تمنا تھی کہ یہ یونیورسٹی سارے ہندوستان کے لئے تعلیم و مذہب کا سرچشمہ ثابت ہوتی، لیکن افسوس کہ وہ اتنی ترقی نہ کر سکی جتنی کہ ہندو یونیورسٹی نے کی ہے، اس خامی کے ذمہ دار گزشتہ زمانہ کے کارکن نہیں ہیں بلکہ مسلم پبلک کی بے پروائی اس کا سبب ہے۔

دیگر برادران وطن کے مقابلہ میں ہم ہمیشہ پیچھے رہے ہیں، چنانچہ گزشتہ زمانہ میں ہم جدید تعلیم میں پیچھے رہ گئے یعنی جب وہ مغربی علوم حاصل کرنے میں مصروف ہوئے تو ہم نے قدم بڑھایا، اس کے بعد انھوں نے ہم سے پہلے سائنس پر توجہ کی، اسی طرح ہم نے ایک زمانہ دراز تک اپنی لڑکیوں کو بھی نہیں بڑھایا، غرض دوسری قومیں ہم سے بہت پہلے سائنس، ریاضی اور دوسرے فنون میں ترقی کر گئیں اب یہی صورت "صنعتی" کے معاملہ میں بھی درپیش ہے کہ ہم دوسری قوموں سے پیچھے ہیں اور اس بیسویں صدی میں بھی ہمارے پاس صنعتی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے۔

یہ بات نہیں ہے کہ صنعتی تعلیم کا ہم کو اب تک خیال نہیں پیدا ہوا تھا بلکہ مدا

سے ہم اس کام کے لئے کوشش کر رہے ہیں، پہلے کالج میں صنعتی تعلیم نہ تھی ۱۹۱۰ء میں نواب وقار الملک کے زمانہ میں اس کے لئے اپیل شائع کی گئی جس پر ہز ہائنس سر آغا خاں اور سید امیر علی کے دستخط تھے، یونیورسٹی قائم ہونے کی تحریک شروع ہو چکی تھی پھر بھی اس مقصد کے لئے کوشش جاری رہی،

۱۹۲۵ء میں کالج کی پنجاہ سالہ جوبلی کے موقع پر ایک لاکھ ۸۰ ہزار روپیہ جمع ہوا گویا کچھ کامیابی ہوئی، مسلم یونیورسٹی نے ہمت کر کے ۱۹۳۵ء میں اس سلسلہ میں ایک حد تک ترقی کی اور بعض کلاسیں کھولیں، پھر ۱۹۳۷ء میں ہز ہائنس سر آغا خاں اور ہز ہائنس نواب صاحب رامپور نے اس طرف توجہ کی اور عطیات کا اعلان کیا نیز اعلیٰ حضرت نظام نے بھی ایک گراں قدر عطیہ کا اعلان کیا اس وقت سے یہ شعبہ ترقی کر رہا ہے، اور طلبہ کی نمایاں تعداد امتحان میں کامیابی حاصل کر رہی ہے، ۱۹۳۸ء میں مزید ترقی اور اضافہ ہوا، اور طلبہ کو الیکٹرک اور میکانیکل کام کرنا سکھایا گیا حتیٰ کہ اب یہ نوبت آ گئی کہ سائنس کے آلات جو مرمت طلب ہوتے ہیں تو ان کی مرمت ہمارے ورکشاپ میں کرائی جاتی ہے، ہم نے ۱۹۳۰ء میں ایف ایس سی کلاس کھولی تھی، لیکن جب تک ہم بی ایس سی کی ڈگریاں عطا نہ کریں، یہ تعلیم کافی نہیں سمجھی جائے گی،

ہندو یونیورسٹی میں اس کا ایک مکمل ڈپارٹمنٹ ہے جو پندرہ لاکھ روپیہ سے قائم کیا گیا ہے، سر رادھا کرشنن نے مزید روپیہ کا قوم سے مطالبہ کیا ہے اور اب وہ ایک کالج اور قائم کر رہے ہیں، مسلم یونیورسٹی کے سامنے اس سلسلہ میں جو اسکیم ہے وہ معمولی ہے یعنی یہ کہ آئندہ جولائی سے انجینئرنگ کلاس وغیرہ کھول دی جائے، حال میں ایک کمیٹی ماہرین فن کی بنائی گئی تھی جس نے اپنی رپورٹ پیش کر دی ہے، ہم کوئی نئی عمارت فی الحال نہیں بنائیں گے، بلکہ موجودہ عمارتوں کے بعض کمرے استعمال کریں گے،

علی گڑھ کے اساتذہ نے نہایت دریا دلی کے ساتھ یہ رضامندی ظاہر کی ہے کہ وہ تھوڑے سرمایہ سے اتنا بڑا ڈپارٹمنٹ قائم کر سکیں گے جتنا ہندو یونیورسٹی نے ۱۵ لاکھ میں کیا ہے اگر ۸ کروڑ مسلمان ایک ایک پیسہ بھی دیں تو ۱۲ لاکھ روپیہ جمع ہو سکتا ہے،

موجودہ زمانہ میں ہر طرف ترقی کا دور ہے، اور جس طرف بھی دیکھئے یہ آواز بلند ہو رہی ہے کہ مسلمانوں کو ٹیکنکل تعلیم دینی چاہئے، پس اے حضرات اگر ہم کو واقعی ہیا

ہندوستان میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کرنا ہے تو اس طرف توجہ کرنی چاہیئے، یہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں بلکہ مسلمانوں کے لئے موت زندگی کا مسئلہ ہے، مجھے یقین ہے کہ اس وقت جو دشواریاں مسلمانوں کو صنعتی تعلیم حاصل کرنے میں پیش آرہی ہیں اس کا سب کو احساس ہے امید ہے کہ اس احساس کی بدولت قوم میں زندگی پیدا ہوگی۔

آنریبل ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان صاحب کی تقریر کے بعد مولوی عبدالحامد صاحب قادری بدایونی نے اردو زبان کی موجودہ حالت کے متعلق ایک تقریر کی جس میں تفصیل کے ساتھ یہ بتایا کہ برادران وطن اس زبان کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں، سلسلہ تقریر میں آپ نے مسٹر سمپورنانند سابق وزیر تعلیم صوبہ متحدہ اور دوسرے ہندو اصحاب کی تحریروں اور تقریروں کے جملے و فقرے پڑھ کر سنائے جو کہنے کے لئے تو ہندوستانی زبان میں ہیں لیکن سنسکرت کے ثقیل و نامانوس الفاظ کی کثرت کی وجہ سے مسلمان تو کیا خود ہندوؤں کے لئے بھی ناقابل فہم ہیں، اسی سلسلہ میں مقرر نے اور بہت سے الفاظ پیش کئے جو عام اور چلنسار الفاظ کی جگہ اب حال ہی میں تجویز کئے گئے ہیں، اور ہر شخص کے لئے اجنبی و نامانوس ہیں آخر میں آپ نے مسلمانوں سے درخواست کی کہ وہ اردو کی حفاظت و ترقی کے لئے کوشش کریں،

مندرجہ بالا تقریر کے بعد سیٹھ احمد ہارون جعفر صاحب نے "صوبہ بمبئی میں مسلمانوں کی تعلیمی حالت" پر انگریزی میں ایک مضمون پڑھا جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے،

صوبہ بمبئی میں مسلمانوں کی تعلیمی حالت

جناب صدر و حضرات! میں اس بات کو اپنے لئے باعث فخر و مسرت سمجھتا ہوں کہ مجھ کو تعلیم جیسے موضوع پر جس سے میرا اور میرے خاندان کا گہرا تعلق رہا ہے، اظہار خیال کا موقع ملا۔ موجودہ زمانہ اس ملک کی تعلیمی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ جیسا کہ آپ کو علم ہے پورا نظام تعلیم گہری تحقیقات اور امتحان کی منزل سے گزر رہا ہے۔ اہم اور بنیادی تبدیلیاں یا تو زیر غور ہیں یا کچھ صوبوں میں ان پر عمل درآمد بھی شروع ہوگیا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس وقت ہم پرانے اور نئے راستوں کے دوراہے پر کھڑے ہوئے ہیں۔ یہاں مجھکو "واردھا اسکیم" کی تاریخ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو گذشتہ چند سالوں سے ہمارے پورے صوبہ میں ماہرین تعلیم کی توجہ کو مبذول کئے ہوئے ہے۔ مجھ کو اسکیم مذکور کے محاسن بھی پیش کرنے کی

ضرورت نہیں ہے کیونکہ پریس اور پلیٹ فارم پر اس کی کافی نکتہ چینی تجزیہ اور تشریح ہو چکی ہے وارڈھا اسکیم پر آپ کی توجہ محض اس پہلو سے کرانا چاہتا ہوں کہ وہ میری رائے میں اس نئے رُجحان اور تبدیلی نقطۂ نظر کی نشان دہی کرتی ہے۔ جو موجودہ "نظام تعلیم" کی نمایاں خصوصیات رہی ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص کو اس حقیقت کا بھی علم ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا نے حال ہی میں دو ماہرین فن تعلیم مسٹر ز ایبٹ' اور ووڈ کو ہندوستان بلایا تھا۔ جنھوں نے اس ملک بالخصوص شمالی ہند کے نظام تعلیمی کا تفصیلی جائزہ لیا اور انھوں نے ایک نہایت قابل قدر رپورٹ جس میں اصلاح نظام تعلیم کی بہت سی مفید تجاویز درج ہیں شائع کی ہے ان ماہرین تعلیم نے ہمارے ثانوی اسکولوں میں کسی پیشہ کی تعلیم کو اختیار کرنے کے متعلق جو سفارشات کی ہیں، ان کا میں خصوصی ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ جہاں تک خود میرے صوبہ بمبئی کا تعلق ہے پچھلی کانگریس گورنمنٹ نے مختلف مسائل تعلیمی پر غور کرنے کی غرض سے متعدد کمیٹیوں کا تقرر کیا تھا اور ان کمیٹیوں کے غور و فکر اور سفارشات کے نتیجہ میں بہت سی نئی تبدیلیاں معرض وجود میں آئی ہیں ان قابل ذکر نئی اسکیموں کے ماتحت میرے صوبہ میں یہ تبدیلی ہوئی ہے کہ کچھ گورنمنٹ ہائی اسکولوں میں پیشہ کی تعلیم کی ابتدا کی گئی ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں مجھے افسوس کے ساتھ یہ بتانا ہے کہ صوبہ بمبئی میں اُردو بولنے والے لڑکوں کی اسپیشل سکنڈری اسکولوں میں پیشہ کی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا ہے۔ اس امر کی خاص ضرورت ہے کہ اگر مسلمانوں کو دوسری قوموں کے مقابلہ میں تعلیمی میدان میں ایک ساتھ کھڑا ہونا ہے تو ان کو بھی حصول تعلیم کے ہر قسم کے مساوی مواقع مہیا کئے جائیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیا اسباب تھے جن کی بنا پر صوبہ بمبئی کے اُردو سیکنڈری اسکول پیشہ کی تعلیم کے ٹریننگ سے علیحدہ رکھے گئے لیکن میں یہ ضرور محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان جیسی اہم قوم کے ساتھ یہ مغائرت کا سلوک پورے ملک کے مفاد کے لئے انتہا درجہ ضرر رساں ہوگا،

گذشتہ سالوں میں مروجہ نظام تعلیم کے خلاف بہت ایجیٹیشن رہا ہے۔ کیونکہ وہ بہت زیادہ لٹریری تھا اور وہ لڑکوں میں صنعت و حرفت کا کوئی ذوق نہیں پیدا کرتا تھا پیشہ کی تعلیم اس نقص کو دور کرنے کی غرض سے داخل نصاب کی گئی ہے اور چونکہ مسلمان بھی دوسری ہندوستان کی بڑی قوموں کی طرح بلکہ اُن سے زیادہ نظام تعلیمی کے اس نقص کی وجہ سے نقصان اُٹھا رہے ہیں۔ اس لئے یہ ضروری اور مناسب ہے کہ جو بھی کوئی اصلاح تعلیم کی اسکیم

رائج کی جائے اس کا فائدہ تمام قوموں کو جن میں اقلیتیں بھی شامل ہوں پہنچایا جائے،

اپنے صوبہ کے مسئلہ تعلیم کے ایک اور پہلو پر بھی میں تبصرہ کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جب کانگریسی گورنمنٹ برسر اقتدار تھی تو ہندوستانی زبان تعلیمی اداروں میں پڑھائے جانے کی بہت کچھ ہمت افزائی کی گئی اور اس کا انتظام کیا گیا۔ اس سلسلہ میں میں ہندوستانی زبان کے اصل مبحث پر کچھ عرض کرنا نہیں چاہتا یہ وہ مبحث ہے جس پر بہت گرما گرم بحثیں ہو چکی ہیں لیکن مجھے آپ کی توجہ اس چیز پر منعطف کرانی ہے کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اُردو کے اسکولوں میں بھی ہندوستانی کو ایک لازمی مضمون قرار دیا گیا ہے اُردو جاری۔ مادری زبان ہے اور ہندوستانی کو بھی خفیف سی تبدیلی کے بعد اُردو زبان ہی خیال کیا جاتا ہے اس لئے ایک اُردو بولنے والے بچہ کے لئے قطعاً ضروری نہیں ہے کہ وہ ہندوستانی پڑھنا سیکھے مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ہندوستانی زبان پڑھانے کے لئے جو استاد مقرر کئے گئے ہیں وہ اُردو رسم الخط سے جس کے ذریعہ اُردو بولنے والے بچوں کو تعلیم دی جائے گی اچھی طرح نہیں واقف ہیں، اور اس طرح ہمارے اسکولوں میں "ہندوستانی" کا رواج ہماری قوم کے لئے نفع بخش ہونے کے بجائے باعث تکلیف ثابت ہو رہا ہے، ہم ہر جگہ سنتے ہیں کہ موجودہ نصاب تعلیم میں مضامین کی بہت بھرمار ہے اور ماہرین تعلیم اس بات کی سخت کوشش کر رہے ہیں کہ ہمارے بچوں کے کاندھوں پر جو بوجھ ہے اسے ہلکا کیا جائے، نصاب تعلیم کو مختصر کرنے کے طریقے ایجاد کئے جا رہے ہیں، اور ایک ایسی صورت حال پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، جس سے کہ بچے اپنی تعلیم اور تعلیمی کام کا کم سے کم بار محسوس کریں، میری رائے میں یہ معاملہ اپنی جگہ پر بہت اہمیت رکھتا ہے ہمارے ماہرین تعلیم کو اس پر توجہ کرنی چاہئے اور ازالہ شکایات کی ہر ممکن تدبیر عمل میں لانا چاہئے،

میں نے نظام تعلیم کے صرف ان خاص خاص پہلوؤں کی جانب اشارہ کیا ہے جو میرے صوبہ سے تعلق رکھتے ہیں، تعلیمی میدان بہت بڑا اور وسیع ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ تعلیم کے ایک طالب علم کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ جملہ تعلیمی مسائل کے ہر ایک پہلو پر بحث کرے اگر وہ ایسا کرے گا تو یہ چیز ایک معمولی آدمی کی حدود سے متجاوز اور ہولنا کی کی مرادف سمجھی جائے گی،

عصر کی موجودہ ضرورت یہ ہے کہ وہ ابتدائی ثانوی اور پیشہ کی تعلیم پر اپنی توجہ کو مرکوز کرے اس بات کی بھی اشد ضرورت ہے کہ ہمارا نظام تعلیم ہماری آئندہ نسلوں

میں ایک صحیح نظریہ علم پیدا کرے ہمیں صرف عالموں کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صحیح قسم کے شہریوں کی ضرورت ہے جو زندگی کے مفید مشن کی تکمیل کر سکیں اور قومیت اور انسانیت کے مفاد کو ترقی دے سکیں،

مندرجہ بالا مضمون کے بعد مولوی نذیر احمد صاحب کشمیری نے دنیوی تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم کی ضرورت پر ایک مختصر تقریر فرمائی اور اسی سلسلہ میں اس امر پر اظہار افسوس کیا کہ مسلمانوں نے وار دھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم پر نکتہ چینی کی لیکن خود کوئی تیسری اسکیم تیار نہیں کی، ضرورت ہے کہ مسلمان ایک ایسی اسکیم تیار کریں جو اُن کی قومی و مذہبی ضرورتوں کو حل کر سکے،

اس تقریر کے بعد رات کا اجلاس ختم ہوا،

اجلاس شعبہ تعلیمی

صدر۔ آنریبل سر سعد اللہ صاحب وزیر اعظم صوبۂ آسام

۳۰ دسمبر ۱۹۳۹ء ۹½ بجے صبح

شعبہ تعلیمی کی صدارت کے لئے ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد صاحب کا نام تجویز کیا گیا تھا لیکن وہ بعض مجبوریوں کی وجہ سے اجلاس میں شرکت نہ کر سکے اس لئے خاکسار آنریری سکرٹری کانفرنس نے آنریبل سر سعد اللہ صاحب وزیر اعظم صوبہ آسام کا نام پیش کیا جو اجلاس میں تشریف رکھتے تھے۔

آنریری سکرٹری نے وزیر اعظم موصوف کے لئے تحریک صدارت کرتے ہوئے کہا کہ حضرات اس وقت کا اجلاس، عام اجلاس نہیں بلکہ شعبہ تعلیمی کا جلسہ ہے یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس اجلاس کی صدارت کے لئے ہمیں ایک لائق صدر کے انتخاب کا موقع حاصل ہوا ہے یعنی سر سعد اللہ صاحب جو ایک مشہور صوبہ کے وزیر اعظم ہیں، اجلاس میں تشریف رکھتے ہیں اور اس اجلاس کی صدارت کے لئے نہایت موزوں و مناسب ہیں، اس لئے میں تحریک کرتا

ہوں کہ آنریبل سر سعد اللہ صاحب اس اجلاس کی صدارت فرمائیں۔

مولوی محمد اکرم خاں صاحب نے اس تحریک کی تائید فرمائی اور عام حاضرین کے اتفاق رائے سے آنریبل سر سعد اللہ صاحب صدارت کی کرسی پر رونق افروز ہوئے،

اعلان صدارت کے بعد سید **الطاف علی** صاحب بی اے نے اس شعبہ کی مختصر رپورٹ پڑھی، اس کے بعد آنریبل سر سعد اللہ صاحب نے افتتاحی تقریر کرتے ہوئے فرمایا،

حضرات! میں آج کے اس اجلاس کا نقلی صدر ہوں، اصلی معنوں میں صدر نہیں ہوں، اصلی صدر **ڈاکٹر ضیاء الدین احمد** تھے جو نہیں آسکے اور کل زبردستی اس عہدہ کے لئے مجھے مامور کیا گیا، ڈاکٹر صاحب ایک تجربہ کار ماہر فن تعلیم ہیں اور میں اس سے محروم ہوں، دوسری مجبوری یہ ہے کہ گلے میں خراش ہے اور ڈاکٹروں نے تقریر کی ممانعت کر دی ہے، اگر تقریر کرتا ہوں تو اپنی جان پر ایک تکلیف مول لیتا ہوں اس لئے بہت مختصر عرض کروں گا،

آپ نے وہ سوال نامہ دیکھا ہوگا جو مختلف تعلیمی امور کے متعلق کانفرنس کی طرف سے شائع ہوا ہے، مجھے اس سلسلہ میں کچھ کہنا ہے، مجھے ان معاملات پر غور کرنے کے لئے پہلے سے موقع نہ ملا، نیز مجھے صرف اپنے ہی صوبہ کے متعلق کچھ واقفیت و تجربہ ہے،

صوبہ آسام میں مسلمانوں کی آبادی ۳۳ فی صدی ہے لیکن خدا کے فضل سے اس نسبت سے تعلیم میں ان کی تعداد کم نہیں ہے بلکہ خاصی ہے، ۱۹۱۲ء میں جب یہ خاکسار صوبہ کی کونسل کا ممبر تھا تو آسام گورنمنٹ کو اس پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ مسلمانوں کی تعلیم میں خاص طور پر امداد دے، ۱۹۱۳ء میں ۲۵ وظیفے مسلمانوں کے لئے مقرر کئے گئے جو آج تک جاری ہیں، چونکہ ہمارے ہندو بھائیوں نے مدد دی تھی لہذا ۳۳ وظیفے ان کے لئے بھی مقرر کئے گئے، ہمارے صوبہ میں ہائی ایجوکیشن اچھی حالت میں ہے پرائمری تعلیم میں بھی مسلمانوں کا اچھا حصہ ہے آسام کی آبادی ۹۰ لاکھ ہے مسلمان تقریباً ۳۰ لاکھ ہیں، ہندوؤں میں ۱۶ لاکھ جاہل اور ناخواندہ ہیں، بنگال کے جو مسلمان آسام میں ہیں ان میں تعلیم زیادہ ہے وہ لوگ ہزاروں روپیہ خرچ کر کے اپنی تعلیم کا معقول انتظام کر رہے ہیں، صوبہ میں تقریباً ایک لاکھ روپیہ مسلمانوں اور اچھوتوں کی تعلیم کے لئے مخصوص کیا گیا ہے ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۹ء تک تعلیمی وزارت کے زمانہ میں مسلمانوں میں تعلیمی ترقی کے لئے میں نے خاص کوشش کی لیکن ابھی مسلمانوں کی تعلیم پر توجہ کرنے کی اور زیادہ ضرورت ہے کیونکہ اسکولوں میں ۴۰۰ ماسٹروں میں صرف ۱۸

مسلمان ہیں،
۱۹۲۴ء میں جب تعلیمی وزارت میرے متعلق کی گئی تو میں نے صوبہ کے گورنر بہرجان سے یہ شرط کرلی تھی کہ جب تک آبادی کے تناسب کے لحاظ سے محکمہ تعلیمات میں مسلمانوں کو ملازمتیں حاصل نہ ہوجائیں گی میں کسی ہندو کا تقرر نہ کروں گا اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ صوبہ میں تعلیم نسواں کی کمی ہے آپ اگر چاہتے ہیں کہ مسلمان تعلیم میں ترقی کریں تو تعلیم کو ان کے لئے دلچسپ بنانے کی کوشش کیجئے، اسی سلسلہ میں آپ نے یہ بھی بتایا کہ ۱۹۱۴ء میں صوبہ آسام میں ایک مسلم کانفرنس کی گئی تھی جس میں بنگال سے ماہرین تعلیم کو بلایا گیا تھا،
سلسلہ تقریر میں جناب صدر نے یہ بھی فرمایا کہ انگریزی تعلیم کے ساتھ دینیات کی تعلیم اردو زبان میں ضروری ہے،
جناب صدر کی تقریر کے بعد ڈاکٹر افضال احمد قادری ایم اے پی ایچ ڈی نے تعلیم پر اپنا ایک "مقالہ" پڑھا" مقالہ کی خواندگی کے درمیان میں جناب صدر ناسازی طبع کی وجہ سے تشریف لے گئے اور خان بہادر آنریبل عزیزالحق صاحب صدارت کی کرسی پر تشریف لائے اور اجلاس جاری رہا،
مقالہ کے ختم ہونے کے بعد مسٹر مظہر علی علوی ایم اے ایڈوکیٹ ہائیکورٹ کلکتہ نے مسلمانوں کے تعلیمی مطمع نظر پر ایک پرزور اور ولولہ انگیز تقریر کی، جس نے مجلس میں اچھی خاصی گرمی پیدا کردی، تقریر کے بعد مسٹر سید حسن برنی ایڈوکیٹ بلندشہر نے حسب ذیل رزولیوشن پیش کیا،

رزولیوشن نمبر ۱

"یہ کانفرنس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو اس فیصلہ پر مبارکباد دیتی ہے کہ آئندہ جولائی ۱۹۴۴ء سے الیکٹریکل انجینیرنگ کی ڈگری کلاسیں ضرور کھول دی جائیں گی اور امید کرتی ہے کہ تمام ہندوستان کے مسلمان امرا، بالخصوص اور جمہور مسلمین بالعموم اس مفید شعبہ کو کامیاب بنانے میں پوری امداد فرمائیں گے،"
محرک نے اس رزولیوشن کو پیش کرتے ہوئے یہ کہا کہ میرا خیال ہے کہ آپ سب حضرات

اس سے متفق ہوں گے کہ یہ ایسی تجویز ہے کہ جس کا مسلمان مدت سے انتظار کر رہے ہیں،
آپ کو معلوم ہو گا کہ ہمارے وطنی بھائیوں نے اس معاملہ میں پہلے سے کوشش شروع
کر رکھی ہے، علی گڑھ میں یہ تحریک بہت دیر سے شروع ہوئی، مسلمانوں کو "صنعتی تعلیم" کی بیحد
ضرورت ہے، یورپ کی جن یونیورسٹیوں میں صنعتی تعلیم دی جاتی ہے وہاں اس پر کروڑوں
روپیہ صرف کیا جاتا ہے، یورپ اس صنعتی تعلیم کی بدولت دنیا میں سب سے آگے بڑھ گیا ہے،
اگر آپ واقعی اس تعلیم کی اہمیت محسوس کرتے ہیں تو اس کے لئے قربانی کرنی چاہیئے،
خان بہادر **خواجہ اسداللہ** صاحب کی تائید کے بعد رزولیوشن بالاتفاق پاس ہوا،
اس کے بعد خان بہادر **فضل قدیر** صاحب ایم ایل اے (چاٹگام) نے حسب ذیل
رزولیوشن پیش کیا،

رزولیوشن نمبر ۲

"مسلمانان بنگال کی تعلیمی پسماندگی کا لحاظ کرتے ہوئے یہ کانفرنس گورنمنٹ
بنگال سے درخواست کرتی ہے کہ وہ ہونہار مسلم طلبہ کے لئے ہندوستان میں اور
ہندوستان سے باہر اعلیٰ تعلیم کے لئے ضروری آسانیاں اور دوسری
سہولتیں بہم پہنچائے"

اس رزولیوشن کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ مسلمان غریب ہیں اور جب تک وظائف
سے یا دوسرے طریقوں سے ان کے لئے سہولت بہم نہ پہنچائی جائے وہ تعلیم میں ترقی نہیں کر سکتے
ڈاکٹر شہید اللہ صاحب پروفیسر ڈھاکہ یونیورسٹی کی تائید کے بعد رزولیوشن بالاتفاق
پاس ہوا،
مندرجہ بالا رزولیوشن کے بعد ابوالمظفر صاحب ٹریژرر ڈھاکہ یونیورسٹی نے حسب ذیل
رزولیوشن پیش کیا،

رزولیوشن نمبر ۳

یہ کانفرنس گورنمنٹ سے سفارش کرتی ہے کہ دیہاتی حلقوں میں اسکولوں کے نصاب
میں زراعت کو اور شہری حلقوں کے عام نصاب تعلیم میں صنعت و

حرفت کو داخل کیا جائے"

محرک نے اس رزولیوشن کو پیش کرتے ہوئے بتایا کہ ہمارے اسلاف جس کام میں مصروف ہوتے تھے خواہ وہ زراعت ہو یا صنعت و حرفت اُس کے متعلق صحیح و عملی تجربہ حاصل کرتے تھے لیکن اب ہر کام بیدلی سے کیا جاتا ہے،

مسٹر عبدالرشید سینیر مارکٹنگ افیسر بنگال نے بیان کیا کہ مجھے گزشتہ ۱۶-۱۷ برس سے بحیثیت ڈپٹی ڈائرکٹر زراعت دیہاتی و شہری زندگی کے دیکھنے کا موقع ملا مسلمانوں کی تعداد تعلیمی حیثیت سے بہت کم ہے زراعت کی تعلیم ہماری تعلیم کا ایک نہایت اہم شعبہ ہونا چاہئے اسی طرح صنعت و حرفت کے کارخانے بھی اُس وقت تک ترقی نہیں کرسکتے جب تک کہ لوگ صنعتی تعلیم حاصل نہ کریں،

تحریک و تائید کے بعد رزولیوشن بالاتفاق پاس ہوا،

اس کے بعد ڈاکٹر عبدالعزیز پوری نے حسب ذیل رزولیوشن پیش کیا،

رزولیوشن نمبر ۴

"آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا یہ اجلاس حکومت ہند اور حکومت صوبہ سرحد سے پُر زور مطالبہ کرتا ہے کہ صوبہ سرحد میں علیحدہ یونیورسٹی قائم کی جائے۔ اس صوبہ کی ضروریات مخصوص ہیں اور تمدنی روایات پنجاب سے مختلف ہیں۔ یونیورسٹی کے قیام کی صورت میں سرحدی قبائل کو بھی استفادہ کا موقع ہوگا"

اس رزولیوشن کو پیش کرتے ہوئے محرک نے بیان کیا کہ صوبہ سرحد کو اب ایک خاص اہمیت حاصل ہے اور فرنٹیر والے نہایت اچھے دماغ کے لوگ ہیں۔ کلکتہ، ڈھاکہ اور پٹنہ میں علیحدہ علیحدہ مستقل یونیورسٹیاں موجود ہیں اسی طرح دہلی، آگرہ، علی گڑھ میں قریب قریب یونیورسٹیاں موجود ہیں اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ دہلی سے پشاور تک صرف ایک یونیورسٹی ہو،

سید الطاف علی صاحب کی تائید کے بعد رزولیوشن بالاتفاق پاس ہوا

اس کے بعد محمد عباس خاں صاحب شروانی نے حسب ذیل رزولیوشن پیش کیا

رزولیوشن نمبر ۵

کیلئے
"ہندوستان کی تاریخ میں بہت سی خامیاں ہیں جن کو رفع کرنے
تحقیق و ریسرچ کی ضرورت ہے تاکہ نئے طریق پر ایک مکمل و جامع تاریخ
لکھی جائے لہذا یہ کانفرنس علی گڑھ ہسٹاریکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا خیر مقدم
کرتی ہے اور کارکنان انسٹی ٹیوٹ کو اس ادارہ کے قائم کرنے پر مبارکباد
دیتی ہے اور مسلمانان ہندوستان سے درخواست کرتی ہے کہ اس ادارہ
کی ہمت افزائی کریں"

اس رزولیوشن کو پیش کرتے ہوئے محمد عباس خانصاحب شروانی نے کہا کہ تاریخ کا مطالعہ
اور صحیح تاریخ سے واقفیت ہر قوم کے لئے نہایت ضروری ہے تاریخ ہمارے لئے سب سے زیادہ
سبق آموز ہے جو ہمارے طرز عمل کی خامیاں اور اس کی اصلاح کے طریقے ہمیں بتاتی ہے آپ نے
اس پر اظہار افسوس کیا کہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں تاریخی ذوق نہیں ہے یہاں تک کہ وہ
اپنے اسلاف اور خاندان کے متعلق بھی ضروری حالات و روایات معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتے
چنانچہ آپ نے بطور مثال بیان کیا کہ جب میں کلکتہ آ رہا تھا تو ایک تعلیم یافتہ اور لائق نوجوان راستہ میں
ہمسفر ہوئے جو پٹنہ کے رہنے والے تھے سلسلہ گفتگو میں معلوم ہوا کہ وہ پٹھان ہیں میں نے دریافت
کیا کہ وہ پٹھانوں کے کس قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا خاندان کب ہندوستان آیا؟ لیکن
وہ اس کا کوئی جواب اس کے سوا نہ دے سکے کہ ہمیں اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں کہ پٹھان ہیں
یہ صورت حالات کس قدر افسوسناک ہے اس لئے ضروری ہے کہ مسلمان تاریخ کی تحقیقات
و مطالعہ کی طرف توجہ کریں"

وحیدی صاحب اڈیٹر عصر جدید کلکتہ نے بیان کیا کہ میں صوبہ بہار کا رہنے والا ہوں
اور ہمارے صوبہ میں بڑے بڑے مشاہیر مصنف اور جلیل القدر علماء گزرے ہیں لیکن موجودہ
عہد کے لوگ ان سے بالکل بے خبر ہیں" اگر ہم میں اپنی تاریخ و روایات کے مطالعہ کا ذوق
ہوتا تو یہ افسوسناک حالت نہ ہوتی"

تحریک و تائید کے بعد رزولیوشن بالاتفاق پاس ہوا"

اس کے بعد مولوی حکیم عبدالرؤف صاحب داناپوری نے حسب ذیل رزولیوشن پیش کیا،

رزولیوشن نمبر ۶

"یہ کانفرنس گورنمنٹ بنگال سے سفارش کرتی ہے کہ وہ جلد از جلد کلکتہ میں ایک آزاد طبیہ کالج قائم کرے"

وجاہت صاحب اڈیٹر عصر جدید کلکتہ کی تائید کے بعد رزولیوشن بالاتفاق پاس ہوا،

اس کے بعد جناب صدر کی طرف سے حسب ذیل رزولیوشن پیش ہو کر منظور ہوا،

رزولیوشن نمبر ۷

"یہ کانفرنس پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس صوبہ متحدہ کی اُس رپورٹ کو جو متعلق جدید تنظیم تعلیم ہے پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے جو اُس کے جلسہ بصدارت نوابزادہ لیاقت علی خاں صاحب سکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ منظور ہوئی اور جو صوبہ متحدہ کی گورنمنٹ میں بھیجی گئی"

مندرجہ بالا رزولیوشن کے سلسلہ میں صدر کی اجازت سے سید الطاف علی صاحب نے ضروری حالات بتلائے کہ کن حالات میں صوبہ متحدہ کی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے یہ رپورٹ مرتب کی اور اس سلسلہ میں کیا جد وجہد عمل میں آئی،

اس کے بعد ڈاکٹر شہید اللہ صاحب نے حسب ذیل رزولیوشن پیش کیا،

رزولیوشن نمبر ۸

"یہ کانفرنس افسوس کے ساتھ دیکھتی ہے کہ صوبہ بنگال میں اب تک مفت اور لازمی تعلیم کا اجرا نہیں ہوا اس لئے وہ گورنمنٹ صوبہ مذکور کو زور کے ساتھ توجہ دلاتی ہے کہ وہ جلد سے جلد اس کے اجرا کا انتظام کرے"

ڈاکٹر شہید اللہ صاحب نے اس رزولیوشن کو پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ جب اس قسم کی تجاویز پیش کی جاتی ہیں تو گورنمنٹ یہ عذر بیان کرتی ہے کہ اس کے پاس روپیہ نہیں ہے

لیکن چونکہ یہ کام اشد ضروری ہے تو گورنمنٹ کو اس کے لئے روپیہ فراہم کرنا چاہئے یا خاص ٹکس لگانا چاہئے جس طرح کہ جرمنی میں ٹیکس لگائے جاتے ہیں،

مولوی ابن امام صاحب کی تائید کے بعد رزولیوشن بالاتفاق پاس ہوا،

مندرجہ بالا تجاویز کے منظور ہو جانے کے بعد شعبہ تعلیمی کا اجلاس ختم ہوا۔

اجلاس شعبہ نسواں

۳۰ دسمبر ۱۹۳۹ء ۲ بجے سہ پہر

اجلاس کا آغاز تلاوت کلام مجید سے ہوا، اس کے بعد ڈاکٹر محمد زبیر صاحب صدیقی نے اجلاس شعبہ کی صدارت کیلئے ڈاکٹر بذل الرحمن صاحب ایم پی ایچ ڈی پرنسپل اسمٰعیلیہ کالج کا نام پیش کیا، آپ نے تحریک صدارت کرتے ہوئے بتایا کہ ڈاکٹر بذل الرحمن صاحب صوبہ متحدہ کے ایک علمی خاندان کے رکن ہیں اور آپ کے خاندان کے افراد اعلیٰ تعلیم یافتہ اور معزز عہدوں پر مامور ہیں آپ پنجاب یونیورسٹی کے ایم اے ہیں اور شروع سے آخر تک اعلیٰ قابلیت کے ساتھ کامیاب ہوتے رہے ہیں آپ نے انگلستان اور جرمنی بھی تعلیم حاصل کی ہے اور عربی کے مشہور ادیب جاحظ پر مقالہ لکھنے کے سلسلہ میں آپ کو ڈاکٹری کی ڈگری حاصل ہوئی ہے، اب آپ اپنی اعلیٰ انتظامی و علمی قابلیت کی بنا پر صوبہ بمبئی کے بڑے کالج کے پرنسپل ہیں اور اپنی قابلیت کے لحاظ سے اس شعبہ کی صدارت کے لئے خاص طور پر موزوں ہیں اور آپ کا زیادہ استحقاق اس بنا پر بھی ہے کہ سروس سے سبکدوش ہونے کے بعد اپنا پورا وقت تعلیم نسواں کی ترقی و ترویج میں صرف کرنا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالعزیز پوری صاحب کی تائید کے بعد جملہ حاضرین کے اتفاق رائے سے ڈاکٹر بذل الرحمن صاحب صدارت کی کرسی پر تشریف لائے، اس کے بعد آپ کی اجازت سے مولوی حاجی محمد مقتدیٰ خاں صاحب سکرٹری شعبہ نسواں نے اپنی رپورٹ پڑھی جو تعلیم نسواں کے متعلق بہت سے مفید خیالات و معلومات پر مشتمل تھی،

یہ رپورٹ ذیل میں ملاحظہ کیجئے،

رپورٹ سکریٹری شعبہ نسواں

جناب صدر محترم و حاضرات وحضرات!
السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ،

غالباً آپ کو معلوم ہوگا کہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا یہ شعبہ تعلیم نسواں حال ہی میں (یعنی اس اجلاس کلکتہ سے چند ہی روز پہلے) کانفرنس کے جدید قواعد و قوانین کے مطابق قائم ہوا ہے۔ اور ابھی تک وہ کمیٹی قائم نہیں ہوئی ہے جس کے مشورہ سے اس شعبہ کو کام کرنا ہے۔ اس لیے ہنوز شعبہ کا باضابطہ کام شروع نہیں ہو سکا ہے۔

لہٰذا اس وقت اس اجلاس میں بجائے کسی پچھلی کارگزاری کی کوئی رپورٹ پیش کرنے کے آئندہ کے لئے صرف چند اصولی باتیں آپ کی توجہ میں لانی غالباً مناسب ہوں گی۔

حضرات! زمین آسمان بدل رہے ہیں، یہ دنیا بدل رہی ہے، مسلمان بدل رہے ہیں اور افسوس ہے کہ اس طور پر بدل رہے ہیں کہ ان کو بدلنا نہیں چاہیے۔ لیکن یاد رکھیے کہ اسلام نہیں بدلا۔ اس کے ازلی و ابدی اصول و قوانین جو درحقیقت سنت اللہ و عادت اللہ ہیں نہیں بدلے اور نہیں بدلیں گے۔ "ولن تجد لسنت اللہ تبدیلا ولن تجد لسنت اللہ تحویلا"۔

ہر چند فلسفہ کی چناں اور چنیں رہی
لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی

وقت نہایت تنگ ہے۔ لہٰذا اس بحث کا موقع نہیں ہے (اور شاید ضرورت بھی نہیں ہے) کہ ان ازلی و ابدی اصول و قوانین کے (یعنی اسلام کے نزدیک) علم اور تعلیم و تعلّم کا کیا مرتبہ ہے۔ ایک ایسی جماعت کے قائم کرنے اور قائم رہنے کی ضرورت بھی مسلّم ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتی رہے۔ لیکن کیا ایسی صرف ایک جماعت دنیا کے لئے یا ملک کے لئے یا شہر یا محلہ کیلئے کافی ہوگی؟ نہیں ہرگز نہیں۔ بلکہ ایسی جماعت ہر گھر میں ہونی چاہیے کیونکہ خداوند عالم جل شانہٗ کا ارشاد یہ ہے کہ "قوا انفسکم واھلیکم نارا وقودھا الناس والحجارۃ" اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو جہنم کی اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔

اس آیۂ کریمہ کی تفسیر کا خلاصہ حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ کے الفاظ میں یہ ہے کہ

"ہر مومن کو لازم ہے کہ اپنے گھر والوں کو دین کی راہ پر لاوے لالچ دے کر، ڈر دکھا کر، پیار سے، مار سے۔ اس پر بھی اگر نہ آویں راہ پر تو ان کی کمبختی۔ یہ بے گناہ ہے۔"

حدیث شریف میں آیا ہے کہ "کلکم راعٍ وکلکم مسئول عن رعیتہ۔" تم میں سے ہر ایک چرواہا ہے اور تم میں سے ہر ایک اپنے گلہ کی نسبت جواب دہ ہو گا۔

ظاہر ہے کہ جس طرح ایک چوکس چرواہا اپنے گلہ کو دوسروں کی ایذا سے بچاتا ہے اسی طرح خود گلہ کو بھی بھٹکنے اور دوسروں کے لئے نقصان رساں ہونے سے باز رکھتا ہے۔ اور انسانی گلہ کی بیرونی و اندرونی آفات سے حفاظت کا مقدم ذریعہ صرف اس کی معقول تعلیم و تربیت اور تہذیب اخلاق ہے۔ پس ہر اس شخص پر جسے خدائے قیوم و دانا نے "گلہ بان" کی حیثیت بخشی ہو (یعنی وہ عیالدار ہو) واجب اور از بس ضروری ہے کہ وہ تا بحد امکان اپنے عیال و اطفال کی تہذیب اخلاق میں کوشش کرے۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو وہ ضرور آخرۃ میں (اور غالباً اس دنیا میں بھی) جواب دہ ہو گا۔

شاید اس قدر عام اشارہ کافی نہ سمجھا جائے اور تعلیم نسواں کے متعلق صریح احکام کی تلاش ہو تو سن لیجئے کہ راعی و رعیت والی مذکورہ بالا حدیث کے آخر میں صاف ارشاد ہے "والمرأۃ راعیۃ فی بیت زوجہا" کہ عورت گلہ بان ہے اپنے شوہر کے گھر کے اندر۔ ایک اور حدیث سنئے اور اس کا مصداق بننے کی کوشش کیجئے۔ خدا ہم سب کی مدد کرے۔ آمین۔ رسول اللہ صلعم فرماتے ہیں :- "مَن عالَ جاریتین حتّی تبلغا جاء یوم القیامۃ انا وھو ھکذا" (وضم اصابعہ) جس کسی نے دو لڑکیاں بھی پرورش کر لیں یہاں تک کہ وہ بالغ ہو گئیں تو (رسول اللہ صلعم نے اپنی مبارک انگلیوں کو ملا ہوا دکھا کر بتایا کہ) قیامت کے دن میں اور وہ یوں آئیں گے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے دو انگلیوں کو ملا کر فرمایا کہ میں اور وہ جنت میں ایسے ہوں گے جیسے یہ دونوں انگلیاں۔ "عول" یعنی پرورش میں جسمانی اور روحانی دونوں قسم کی پرورشیں شامل ہیں۔

ایک اور ارشاد ہے "مَن ابتلی عن ھذا البنات فاحسن الیھنّ کنّ لہ ...

من النار" جو کوئی ان بیٹیوں کے ذریعہ سے جانچ میں پڑا اور پھر ان کے ساتھ بھلائی کی تو وہ (لڑکیاں) اس کے لئے دوزخ کی آگ سے پردہ بن جائیں گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ماں باپ کے لئے لڑکیاں ایک ابتلا یعنی جانچ اور امتحان ہیں۔ اور اگر ان کے ساتھ بھلائی (یعنی اچھی تعلیم وتربیت اور ہر قسم کی نگہداشت) کی جائے تو فلاح آخرت کا موجب بھی بن سکتی ہیں۔

ایک اور اہم بحث لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم وتربیت کی جانب توجہ کے اندر باہمی نسبت کا مسئلہ ہے۔ یعنی لڑکوں اور لڑکیوں میں سے کون اس بارہ میں زیادہ توجہ کا مستحق ہے۔ جہاں تک میں نے غور کیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ اسلام نے یہاں بھی مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کو واجبی حقوق دئے ہیں۔ اور وہ حقوق عدل ومساوات کے حقوق ہیں لیکن اس وقت جو لڑکوں اور لڑکیوں کے مابین تعلیمی عدم مساوات ہے وہ اتنی صاف محسوس ہوتی ہے کہ اس کیلئے لمبے چوڑے شمار واعداد کی مطلق ضرورت نہیں رہی۔ حال آں کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ "من کانت له انثىٰ فلم یئدها ولم یهنها ولم یؤثر ولده علیها ادخله الله الجنة" جس کے یہاں لڑکی ہو اور وہ اسے نہ زندہ گاڑے (جیسا کہ عیاذاً باللہ عرب جاہلیت کرتے تھے) اور نہ اس کی ذلت واہانت کرے اور نہ بیٹے کو اس پر ترجیح دے خدا اسے ضرور جنت میں داخل کرے گا۔ خدا کا شکر ہے کہ زندہ درگور کرنے کی رسم تو مسلمانوں میں باقی نہیں ہے۔ لیکن مختلف حیثیتوں سے لڑکیوں کی اہانت اور بیٹوں کو بیٹیوں پر ترجیح (کہ یہ خود بہت بڑی اہانت ہے) اس سے شاید بہت ہی تھوڑے مسلمان عہدہ برآ ہوں گے۔

لڑکیوں کی تعلیم کی اہمیت کے لئے ایک اور حدیث پر غور فرمائیے "اللہ اللہ فی النساء فانهن امانات عندكم فمن لم يأمر امرأته بالصلوٰة ولم يعلمها فقد خان الله ورسوله" عورتوں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو خدا سے۔ کیوں کہ وہ تمہارے پاس امانت ہیں۔ پس جس نے اپنی بی بی کو نماز کا حکم نہ دیا اور اسے تعلیم نہ دی اس نے خدا اور اس کے رسول کے ساتھ خیانت کی۔ لیکن ایک اور نتیجہ جو اس حدیث سے نکلتا ہے اس پر بھی تدبر فرمائیے۔ وہ یہ کہ جس طرح شادی کے بعد عورت سے متعلق اکثر ذمہ داریاں اس کے باپ یا بھائی سے اس کے شوہر کی طرف منتقل ہو جاتی ہیں اسی طرح تعلیم کی ذمہ داری بھی گویا جہیز کی طرح باپ کے گھر سے عورت کے ساتھ اس کے شوہر کے گھر جاتی ہے۔ اور میں کہوں گا کہ اگر کوئی شوہر اپنی بی بی سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ اس کے گھر کے اندر ایک

"گلہ بان" کی حیثیت سے ہے یعنی اس کے بچوں کی عمدہ تعلیم و تربیت کرے اور اس کے گھر کی ہر قسم کی خبرگیری رکھے اور اس کو اپنا حق سمجھتا ہے تو اُسے بھی اس ذمہ داری سے اپنے آپ کو سبکدوش نہ سمجھنا چاہیئے جو بی بی کی تعلیم و تربیت کی اُس پر عائد ہوتی ہے اور جس کے بغیر جائز طور پر وہ امید اُس سے قائم نہیں کی جا سکتی جو صرف ایک تعلیم و تربیت یافتہ ماں سے وابستہ کی جا سکتی ہے "ولھن مثل الذی علیھن" (قرآن کریم) عورتوں کے (مردوں پر) وہی حقوق ہیں جو (مردوں کے) عورتوں پر ہیں۔

یہ تو ہوا، مگر اے حاضرات اور حضرات! اصل اور مقدم سوال یہ ہے کہ ہماری بچیوں کی تعلیم کس قسم کی ہو۔ یہ وہ سوال ہے جو ہمارے یہاں (کل ہندوستان میں بلکہ دنیا بھر میں) ہنوز غیر منفصل ہے۔ کیوں کہ اس زمانہ کی تعلیم باعتبار اکثر وہ نتائج پیدا کرنے سے قطعاً قاصر رہی ہے جو تعلیم کے بلکہ عین انسانیت کے ہوتے چاہئیں۔ لہذا یہ مقتضائے دانش نہیں ہے کہ ہم ایسے زمانہ میں جب کہ صنف نازک کی تعلیم کا نازک مسئلہ زیرِ غور ہے پچھلے تجربہ سے فائدہ نہ اٹھائیں اور پچھلے نقصانات سے بچنے کی کوشش نہ کریں۔ یہ شان ایمان نہیں ہے۔ کیوں کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ لایلدغ المومن من جحر مرتین "مسلمان ایک سوراخ سے دو بار ڈنک نہیں کھاتا۔"

حضرات! لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ بہ نسبت لڑکوں کے خاص طور پر اس سبب سے نازک تر ہے کہ علاوہ ان فرائض کے جو مردوں کے ساتھ عورتوں کے مشترک ہیں اُن کا بہت بڑا (اور یقیناً مدار علیہ فرض) خانہ داری اور پرورش اطفال کا فرض ہے۔

اس سلسلہ میں حدیث شریف کے اس ٹکڑے کو پھر یاد فرمائیے جو پہلے پیش ہو چکا ہے یعنی المراۃ راعیۃ فی بیت زوجھا "عورت اپنے شوہر کے گھر میں گلہ بان ہے"

ایک حدیث میں بی بی کو مرد کے ایمان کا معین فرمایا گیا ہے۔ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی کہ بعض لوگ صرف جمع مال کے درپے رہتے ہیں اور اسے خدا کی راہ میں صرف نہیں کرتے اور اصحاب نے پوچھا کہ یا رسول اللہ کونسا مال افضل ہے تو آپ نے فرمایا "افضلہ لسان ذاکر و قلب شاکر و زوجۃ صالحۃ تعین المومن علی ایمانہ۔ سب سے افضل مال ذکر کرنے والی زبان اور شکر کرنے والا قلب اور نیک بی بی ہے جو مومن کو اس کے ایمان کے قائم رکھنے میں مدد دیتی ہے"

ایک اور ارشاد ہے:

کیا میں نہ بتاؤں کہ جو مال جمع ہونا چاہئے اس میں بہتر کونسا مال ہے؟ پھر آپ خود ہی جواب ارشاد فرماتے ہیں کہ وہ مال نیک بی بی ہے۔ اس کے بعد حضور صلعم خود ہی صراۃ صالحۃ "یعنی نیک بی بی کی تعریف بیان فرماتے ہیں جو یہ ہے اذا نظر الیھا زوجھا سرتہ واذا امرھا اطاعتہ واذا غاب عنھا حفظتہ جس وقت شوہر اس کی طرف دیکھے تو وہ اُسے خوش کرے، جس وقت اُسے کوئی حکم دے تو اس کی تعمیل کرے اور جب شوہر اس سے غایب ہو تو اس کے (یعنی اس کے گھر بار کی) حفاظت کرے۔

اور اس بات کی معلوم کرنیکے لئے مطلق کسی بہت بڑی عقل کی ضرورت نہیں ہے کہ عورت کے اندر یہ عمدہ اور ضروری صفات کس طرح پیدا ہو سکتی ہیں؟ ان صفات کے پیدا ہونیکا واحد ذریعہ عمدہ تعلیم و تربیت ہے، عمدہ تعلیم تربیت ہے، عمدہ تعلیم و تربیت ہے اور کونسا مرد ہے جو اپنی عورت کے اندر یہ صفات دیکھنا نہ چاہے گا؟ اور کونسا وہ مرد ہو سکتا ہے جو ایک جاہل کندۂ ناتراش عورت کے اندر ان اوصاف حمیدہ کا جو یاں ہو گا۔ ؎

ہر آں کہ تخم بدی کشت چشم نیکی داشت
دماغ بیہودہ پخت و خیال باطل بست

حضرات! ہمارے بچوں کی تعلیم میں اس وقت جو مسلمہ طور پر سب سے بڑی کمی ہے، وہ مذہبی تعلیم اور اسلامی اسوہ کا فقدان ہے۔ اس لئے نہ صرف خود لڑکیوں کی تعلیم کو صحیح راستہ پر لگانے کے لئے بلکہ لڑکوں کی تعلیم کے بنیاد مستحکم کرنے کے لئے بھی لڑکیوں کے نصاب میں چند باتوں کا لحاظ از بس ضروری ہے، مثلاً مذہبی تعلیم، اسلامی خواتین کا اسوۂ حسنہ اور خاص فرایض نسواں (جیسے خانہ داری اور پرورش اطفال وغیرہ وغیرہ)

حضرات! قرآن پاک نے عورت کی تخلیق کا مقصد یہ ارشاد فرمایا ہے کہ لتسکنوا الیھا کہ مرد کا نفس اس سے یعنی عورت سے تسکین پائے۔ اور یہ اعلیٰ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جب تک لڑکیوں کی تعلیم صحیح اصول پر جاری نہ ہو۔

حضرات! اگر آپ مسلمانوں کی تاریخ کا مطالعہ فرمائیں تو آپ دیکھیں گے کہ انکی ہر قسم کی زندگی اور ہر قسم کی جد و جہد میں عورتوں کا کیسا بلند اور غیر منفک حصہ رہا ہے۔ رسول اللہ صلعم پر سب سے پہلے ایمان لانے والی ایک خاتون حضرت خدیجہؓ تھیں۔ اور پھر آپ کی تسکین خاطر مبارک کی اور خدمت اسلام میں جو حصہ حضرت خدیجہؓ نے لیا وہ تاریخ اسلام کا نہایت شاندار

باب ہے۔ حضرت عائشہؓ اُن (آٹھ) اصحاب میں ہیں جو اپنے زمانہ میں فقہ کے امام تھے۔ حضرت عائشہؓ کی قوت مشاہدہ اور قوت استدلال اور قوت فکریہ بھی بے مثل تھی۔ حضرت امام حسنؓ کی قناعت اور حضرت امام حسینؓ کا صبر و استقلال قیام قیامت تک کے لئے بے نظیر ہیں۔ لیکن جب آپ ان حضرات کے ان اوصاف کو یاد کریں تو یہ بھی یاد رکھئے کہ انھوں نے یہ اوصاف اپنی والدہ حضرت فاطمہؓ بنت رسول اللہ سے ورثہ میں پائے تھے۔

حضرت عبداللہ ابن زبیر کا عزم نہایت سبق آموز ہے۔ مع ہذا جان لیجئے کہ وہ حضرت عائشہؓ کے بھانجے اور حضرت اسماءؓ بنت ابی بکرؓ کے فرزند تھے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی صدق مقالی کی حکایت ہے انگریزی مدارس کے بچے تک واقف کئے جاتے ہیں۔ اور اس تمہید کے ساتھ کہ اس کا سب سے پہلا سبق انھیں اپنی والدہ ماجدہ سے حاصل ہوا تھا مسلمانوں کی علمی تاریخ کا مطالعہ کیجئے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ بڑے بڑے جلیل القدر علما بلکہ اماماں فن نے عالمہ خواتین کے تلمذ سے بھی استفادہ کیا تھا۔ اور یہ کہ اُن کی تعلیمی ترقی میں ان کی ماؤں اور بہنوں کا کتنا وسیع حصہ تھا۔ یہی نہیں بلکہ مردوں کو حکومت دلانے اور اُن کی حکومت قائم رکھنے میں عورتوں نے جو حصہ لیا وہ تاریخ کے صفحات میں جلی عنوان میں مذکور ہے۔ انھوں نے جنگ کے میدانوں کو سر کرنے میں جنگ جویوں کا جہاں تک ہاتھ بٹایا وہ بجائے خود ایک معرکہ ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ایک ایسا نصاب تجویز کیا جائے جو تمام سرکاری اور غیر سرکاری زنانہ مدارس میں جاری ہو اور جس میں لڑکیوں کو عام دینی اور ان کے مخصوص فرائض و واجبات بتائے جائیں۔ اور وہ نصاب ایسا ہو جو جامعیت کے ساتھ کم سے کم وقت میں اپنا مقصد پورا کر دے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اگر کوشش کی جائے تو انشاءاللہ ضرور کامیابی ہوگی۔

لیس للانسان الا ما سعیٰ۔ السعی منا والاتمام من اللہ

طالب لعل و گہر نیست وگرنہ خورشید

ہم چناں در عمل معدن و بحر ست کہ بود

اس زمانہ میں تعلیم کی انگریزی یا اُردو یا ہندی زبان ہے لیکن تعلیمی ترقی سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ صحیح تعلیمی نصاب ہے جس کے نہ ہونے سے اپنے بچوں کے تعلیمی نتائج میں ہمیں ابھی تک خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی ہے اور چونکہ یہ امر مسلم ہے کہ بچوں کا پہلا مدرسہ

ماؤں کا آغوش اور زانو ہوتا ہے تو یہ تسلیم کرنے میں کسی تامل کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ لڑکیوں کا تعلیمی نصاب بدرجۂ اولیٰ صحیح ہونا چاہیئے ؎

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا میرود دیوار کج

مندرجہ بالا "رپورٹ" کے ختم ہونے پر جناب ڈاکٹر بذل الرحمن صاحب نے بطور خطبہ صدارت ایک تقریر فرمائی جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے،

ملخص خطبہ صدارت جناب ڈاکٹر بذل الرحمن صاحب

حضرات آپ صاحبوں کو معلوم ہے کہ اس شعبہ کی صدارت بیگم مولانا محمد علی مرحوم کرنے والی تھیں، اور مناسب بھی یہی تھا کہ کوئی خاتون ہی اس شعبہ کی صدارت کرتیں مگر بدقسمتی سے وہ تشریف نہ لاسکیں، میں جناب نواب صدر یار جنگ صاحب بہادر اور کارکنان کانفرنس کا ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے اس خدمت کے انجام دینے کا موقعہ دیا۔ اب جبکہ میں اس اجلاس میں آیا تو ڈاکٹر محمد زبیر صاحب نے میری نسبت آپ کے دلوں میں توقعات پیدا کر دیں، اور ڈاکٹر عبدالعزیز صاحب پوری نے میری نسبت خوش گوار الفاظ فرما کر میری مشکلات کو اور بڑھا دیا،

میری مشکل یہ تھی کہ مجھے اس تنگ وقت میں "خطبہ صدارت" طیار کرنے کا موقع نہ مل سکتا تھا۔ مگر میں نازاں ہوں کہ جناب مولوی مقتدیٰ خاں صاحب سکرٹری نے میرا کام سہل کر دیا اور اپنی رپورٹ میں وہ باتیں لکھدیں جو خطبہ میں سنائی جا سکتی ہیں جس کے لئے میں انکا شکر گزار ہوں،

حضرات کانفرنس کی اصل غرض تبادلہ خیالات ہے تاکہ متحد الخیال ہو کر ایک لائحہ عمل تیار کیا جائے۔ لیکن لائحہ عمل تیار کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ زمانہ ماضی و زمانہ حال پر نظر کی جائے، ان دونوں چیزوں پر نظر کرنے سے مستقبل کے لئے لائحہ عمل بنایا جا سکتا ہے یہ لائحہ عمل عورتوں کی تعلیم کے لئے بنانا ہے جنھیں اسلام نے مردوں کے برابر حق اور درجہ دیا ہے تمام مذاہب میں اسلام ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے عورتوں کو مساوی درجہ دیا ہے، اسلام آنے سے

قبل ہندوستان کی عورتیں نہایت ذلیل سمجھی جاتی تھیں، مگر اسلام نے انھیں جس بلند مرتبہ پر پونہچایا اس کا اندازہ نورجہاں اور چاند بی بی کے حالات سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

اگر اب آپ اپنے سامنے زمانہ ماضی کو رکھیں گے تو حال خود ہی روشن ہو جائے گا بڑی دقت یہ ہے کہ بالعموم ہماری مجلسیں مجالس عزا ہوتی ہیں جن میں زمانہ حال کا مرثیہ پڑھا جاتا ہے۔ اور ماضی سے صحیح نتائج نکلنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ ضرورت یہ ہے کہ صحیح نتائج نکال کر مستقبل بہتر کیا جائے۔ ایک زمانہ وہ تھا جبکہ ہم ایک ہی گھر میں پشتوں تک رہتے چلے آتے تھے۔ اور متعدد خاندان ایک گھر میں گزار دیتے تھے مگر اب حالات بدل گئے۔ اور ہم روزی کے لئے گھر چھوڑنے پر مجبور ہوتے ہیں وہ خواتین جو چہار دیواری میں رہتی تھیں، اب انتظام خانہ داری کے لئے باہر نکلنے پر مجبور ہوتی ہیں، اس زمانہ میں ہماری برادریوں کا دائرہ پورے شہروں بلکہ پورے ملک تک وسیع ہو گیا ہے اور طرز حکومت بھی بدل چکا۔

ٹاؤن ایریا سے لے کر کونسلوں اور اسمبلیوں تک میں مرد اور عورت دونوں ممبر ہو کر جا سکتے ہیں، ظاہر ہے کہ عورتوں کو بھی ان بدلے ہوئے حالات سے مطابق اپنے آپ کو بنانا چاہئے اور صاف ظاہر ہے کہ اس کام کی تیاری کے لئے سب سے زیادہ بہتر ذریعہ تعلیم ہے، غنیمت ہے کہ لڑکیوں کے لئے نئے مدارس قائم ہو رہے ہیں، مگر بڑی دقت یہ ہے کہ استانیاں بہاں قابل نہیں ملتیں، اگر ہم لوگ واقعی طور پر ان مدارس کو کامیاب بنانا چاہیں تو ہمیں چاہئے کہ استانیاں طیار کرنے کے لئے مدارس قائم کریں اور ان میں استانیوں کو ٹرینڈ کریں

دوسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ پوری عمر کی عورتوں کو خواندہ بنانے کی طرف توجہ کی جائے۔

دوسری قوموں کے لوگ اس کام کو وسیع پیمانہ پر کر رہے ہیں، اگر ہم نے اس طرف توجہ نہ کی تو ہمیں اس کا خمیازہ اٹھانا پڑیگا۔ ہندوؤں اور پارسیوں وعیسائیوں میں علاوہ تعلیم کے دست کاری اور کھانا پکانا اور مریضوں کی خدمت کرنا جسے نرسنگ کہتے ہیں، سکھایا جاتا ہے اس لئے اور قوموں کی نرسیں بکثرت ملتی ہیں۔ مگر مسلمان نرس کبھی دستیاب نہیں ہوتی۔ اس لئے مسلمان مجبور ہو کر دوسری قوموں کی نرسوں کو تیمارداری کے لئے اپنے گھروں میں داخل کرتے ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ عورتوں کو اپنی روزی کمانے کے لائق بنایا جائے، اور انہیں ایسے مواقع بہم پہونچائی جائیں کہ

وہ اپنی روزی کما سکیں،

تیسرا اہم مسئلہ سیاسی حالات کی تبدیلی ہے،

بدقسمتی یہ ہے کہ مسلمان عورت کو صرف مائیں بننے کے اعتبار سے دیکھتے ہیں اور صرف یہی کہتے ہیں کہ وہ اچھی مائیں بنیں، مگر جبکہ شہریت کے حقوق انہیں مثل مردوں کے ملے ہوئے ہیں، تو ضرورت ہے کہ مسلمان عورتوں کو شہری بننے کے لئے تیار کیا جائے،

مگر میرا خیال یہ ہے کہ یہ کام مرد نہیں کر سکتے بلکہ خود عورتیں ہی اپنی بہنوں کو خواندہ بنا سکتی ہیں اس لئے میری درخواست معزز خواتین سے یہ ہے کہ وہ اپنی جاہل بہنوں کو پڑھائیں، اور زمانہ کے حالات سے انہیں واقف کریں، ان کی کوشش سے ہر گھر ایک اچھا خاصہ مدرسہ بن سکتا ہے،

جناب صدر کی مندرجہ بالا تقریر نہایت توجہ سے سنی گئی اس کے بعد متعدد خواتین نے مقالات پڑھے، چنانچہ ایک مقالہ بیگم شمس النہار صاحبہ پروفیسر لیڈی بریبورن کالج کلکتہ نے "بنگال میں تعلیم نسواں" کے عنوان سے پڑھا جو حسب ذیل ہے،

بنگال میں تعلیم نسواں

"ہندو اور مسلمان دونوں قوموں میں تعلیم نسواں کی ضرورت اب اچھی طرح محسوس کی جانے لگی ہے"

یہ ریمارک صوبہ بنگال کی نویں پنجسالہ رپورٹ ۱۹۳۲ء لغایت ۱۹۳۷ء میں درج ہے اس کی تائید اعداد و شمار سے بھی ہوتی ہے جن سے ظاہر ہو گا کہ تعلیم نسواں کی ہمارے صوبہ میں برابر ترقی ہو رہی ہے

مندرجہ بالا پانچ سال کے عرصہ میں لڑکیوں کے کالجوں کی تعداد میں چار کا اضافہ ہوا۔ ہائی اسکول پچیس بڑھے اور مڈل اسکولوں کی تعداد میں اکتالیس کی زیادتی ہوئی ۱۹۲۱-۲۲ء میں میٹرکولیشن کا امتحان پاس کرنے والی طالبات کی تعداد صرف ایک سو دو تھی۔ دس سال کے عرصہ میں ۴۳۹ تک بڑھ گئی اور ۱۹۳۶-۳۷ء میں یہ تعداد قریب قریب سہ چند ہو گئی۔ اور وہ لڑکیاں جنہوں نے میٹرکولیشن پاس کیا تعداد میں ایک ہزار انچاس تھیں،

لڑکیوں میں اعلیٰ تعلیم کی خواہش اس قدر بڑھ گئی ہے کہ لوگ بہت زیادہ قربانیاں کرکے تعلیم دلا رہے ہیں، متوسط الحال تعلیم یافتہ ہندوؤں کے رسم و رواج میں یہ ایک عجیب صورت حال پیدا ہو گئی ہے کہ یونیورسٹی کی ڈگری کی وجہ سے لڑکیاں شادی کی زیادہ اہل سمجھی جاتی ہیں کہا جاتا ہے کہ دولہا کی طرف کے لوگ اب یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ہونے والی دولہن نے کس قدر یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کی ہے۔ اور اگر کوئی لڑکی اپنی روزی آپ کما کر غیر شادی شدہ رہنا چاہتی ہے تو اس کو اعلیٰ تعلیم کی اور بھی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ توقع ہے کہ چند سال کے عرصہ میں مسلم تعلیم یافتہ خاندانوں میں بھی یہی صورت حال پیدا ہو جائے گی۔ بلکہ اب بھی لڑکیوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کا مطالبہ کیا جانے لگا ہے' اور گزشتہ چند سالوں میں ان کی ترقی کی رفتار بہت تیز ہو گئی ہے'

بچپن کی شادی لڑکیوں کی تعلیم میں بہت بڑی رکاوٹ تھی۔ سارد ایکٹ کے پاس ہونے سے جو اگرچہ امید کے مطابق اثر انداز نہیں ہوا پھر بھی اس کی وجہ سے روز افزوں تعداد میں لڑکیاں اسکولوں میں جانے لگیں اور اس طرح بچپن کی شادی خود بخود خلاف قانون ہو گئی

پردہ بھی لڑکیوں کی تعلیم میں ایک سخت رکاوٹ تھا لیکن اب پردہ کی رسم بنگال میں سرعت کے ساتھ اٹھ رہی ہے۔

۱۹۳۶-۳۷ء میں ۳۸۲ لڑکیوں نے انٹرمیڈیٹ ۲۰۸ نے بی اے اور ۱۴ نے ایم اے کے امتحانات پاس کئے۔ ایک خاص بات جو ترقی تعلیم کی نویں پنجسالہ تعلیمی رپورٹ میں نظر آتی ہے۔ اور جس پر خاص توجہ مبذول ہوتی ہے وہ جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا تعلیم میں مسلمان لڑکیوں کی ترقی ہے' مسلمان لڑکیوں کی ترقی تعلیم بالخصوص اونچی کلاسوں میں بہت ہی ہمت افزا ہے یہ ریمارک بھی رپورٹ مذکور میں درج ہے۔ اگر ہم اس صوبہ کی مسلمان عورتوں میں بیداری کی تاریخ پر ریویو کریں تو ہم کو گزشتہ صدی کے آخری حصہ پر نظر کرنی ہوگی۔

اب سے پانچ سال پہلے یا اس سے بھی کچھ قبل مسلم نوجوانوں کی ایک جماعت جو اس صوبہ میں انگریزی تعلیم کی پھیلانے والی تھی اس نے تعلیم نسواں کے سلسلہ میں تعمیری کام ایک بالکل نئے طریقہ پر شروع کیا انھیں نے ڈھاکہ سے ایک غیر مکمل یونیورسٹی کا سا آغاز کیا جہاں سے پردہ کے ساتھ لڑکیوں کی تعلیم کی مختلف اضلاع بنگال میں نگرانی کی جاتی تھی' ایک مخصوص نصاب تھا اور باقاعدہ امتحانات لئے جاتے تھے۔ اس کے بعد دوسرا دور آیا

جبکہ مسز آر ایس حسین جو تعلیم نسواں کی زبردست رہنما اور اس صوبہ میں طبقہ خواتین کی اصلاح کی زبردست حامی تھیں انھوں نے اپنے شوہر کے جوان العمری میں انتقال فرمانے پر ہر قسم کے توہمات کی جکڑبندیوں کو پس پشت ڈال کر اپنی زندگی کو تعلیم نسواں کے لئے وقف کردیا ان کو اپنے مشن سے کچھ ایسے جذبے کے ساتھ محبت تھی کہ وہ کسی سخت سے سخت مشکل اور محنت کو خاطر میں نہ لاتی تھیں۔ سخاوت میموریل اسکول جس کو ۱۹۱۱ء میں انھوں نے اپنے شوہر کی یادگار میں قائم کیا اور جس کا سرمایہ ابتداءً دس ہزار روپیہ تھا اور صرف چند لڑکیاں تھیں شدید مخالفتوں سے گذر کر یہ اسکول اب ترقی کرکے ایک ایسا کامیاب ادارہ بن گیا ہے کہ ہر کوئی قوم اس پر فخر کر سکتی ہے۔

بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ بنگال میں جدید خیالات کی ترویج مسز آر ایس حسین کی تقریروں اور تحریروں کا نتیجہ ہے تعلیم یافتہ مسلم خواتین بنگال آج اس راستہ پر چل رہی ہیں جو انھوں نے دکھایا تھا۔ رضاکارانہ طریقہ پر تعلیمی کام کرنے والوں میں مسز ایچ اے حکیم کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ حال میں خواتین ممبران مجالس قانون ساز بھی لڑکیوں کی تعلیم میں گہری دلچسپی کا اظہار کر رہی ہیں۔

پرائیوٹ کوششوں کے علاوہ منجملہ دوسرے مفید سرکاری اداروں کے ایک گورنمنٹ مسلم زنانہ ٹریننگ اسکول کلکتہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کا صرف ایک ادارہ کافی نہیں ہے۔ عورتوں کی تعلیمی ترقی کے لئے اس امر کا تسلیم کرنا ضروری ہے کہ خواتین ٹیچروں اور نگرانی کنندگان کی معقول تعداد ہونی چاہیے کیونکہ یہ امر مسلمہ ہے کہ ابتدائی تعلیم کی بنیادی کلاسوں میں عورتیں بہترین ٹیچر ثابت ہوئی ہیں۔ اور اس لئے لڑکیوں کے مدرسہ کے لئے انکا مہیا کرنا ناگزیر ہے لیکن افسوس ہے کہ بدقسمتی سے کم از کم ہماری قوم میں مسلمان استانیوں کی بے حد کمی ہے۔

پرائمری ایجوکیشن ایکٹ کے صوبہ کے مختلف اضلاع میں نفاذ کے بعد ٹرینڈ استانیوں کی بہت زیادہ ضرورت محسوس ہوگی اس لئے ضرورت ہے کہ نہ صرف موجودہ مسلم ٹریننگ اسکول کی اصلاح و ترقی کی جائے بلکہ اسی قسم کے دوسرے جدید ٹریننگ اسکول بھی کھولے جائیں۔

ہماری قوم کی تعلیم نسواں کی تاریخ میں لیڈی بریبورن کالج کلکتہ کا قیام ایک نئے باب کا اضافہ کرے گا۔ کالج مذکور سخت مخالفت کے باوجود کھولا گیا ہے اور اس کے کھولے جانے کے خلاف سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اعلیٰ تعلیم میں مسلمان لڑکیوں کی تعداد اس قدر کم ہے کہ

ایک علیحدہ کالج کا قیام غیر ضروری ہے'

کالج کے ایک ہی سال کے قیام میں یہ چیز بغیر کسی شک وشبہ کے پایہ ثبوت کو پہونچ گئی ہے کہ چند سال کے عرصہ میں وہ اس صوبہ کے ہر ایک زیادہ سے زیادہ کامیاب زنانہ کالج کے ہم پایہ ہو جائے گا' صوبہ کے قریب قریب ہر ایک شہر سے لڑکیوں نے اس سال داخلہ لیا ہے ۔ ہم صمیم قلب اور دلی شکر گزاری کے ساتھ گورنمنٹ کو اس عظیم الشان کارنامہ پر مبارکباد دیتے ہیں ہم کو اُس دن کا بھی انتظار کرنا چاہیئے جبکہ صرف ایک کالج مسلمان طالبات کی ضروریات کو پورا نہ کر سکے گا ۔ اور جب کہ بہت سے کالج صوبہ کے مختلف حصوں میں قائم ہو جائینگے'

بنگال میں تعلیم نسواں کی تاریخ پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم کو انجمن حمایت الاسلام کو بھی فراموش نہ کرنا چاہیئے جس نے زمانہ سابق میں مسلمان عورتوں کی فلاح و بہتری میں بہت بڑا حصہ لیا ۔ اس انجمن کا ایک مقصد عورتوں کو یکجا جمع ہونے کی سہولت بہم پہنچانا تھا تاکہ اُن کے نقطہ نظر میں وسعت پیدا ہو اور وہ اپنے آپ کو اچھی مائیں اچھی بیویاں اور عمدہ شہری یا بالفاظ دیگر اپنی زندگیوں کو مفید حسن آفریں اور اعلیٰ بنانے کی تعلیم دے سکیں ۔ اگرچہ یہ انجمن تعلیمی ادارہ نہیں ہے لیکن اس نے سنہ ۱۹۱ء سے مسلم خواتین بنگال کی بے لوث بیش قیمت خدمات انجام دی ہیں

مندرجہ بالا سطور میں میں نے مسلم بنگال میں گذشتہ پچاس سال کی تعلیم نسواں کی تاریخ پر ریویو کیا ہے اور بغیر پس و پیش کہا جاسکتا ہے کہ طبقہ نسواں کی موجودہ حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے آج کے بنگال اور پچاس سال پہلے کے بنگال میں بہت بڑا فرق پیدا ہو گیا ہے ۔ گذشتہ صدی کے اختتام پر ہم جہالت کی تاریکی میں تھے اور اس صدی کے شروع میں عام بیداری ہے صرف پچاس سال کی مدت میں اس قدر حیرت انگیز تبدیلی واقع ہوئی ہے اس بیداری کی تاریخ کا ایک خاص پہلو جس کو بلا خوف تردید عرض کیا جا سکتا ہے یہ ہے کہ ترقی کی ساری تیز رفتاری گذشتہ بیس سال کے عرصہ میں ظہور پذیر ہوئی ہے اور اس کا تمام تر راز ان بکثرت حقوق نسواں میں پنہاں ہے جو اسلام نے عورتوں کو دیے ہیں ۔ مسلمان عورتوں کو نہ تو مجالس قانون ساز سے اپیل کرنے کی ضرورت ہے اور نہ دوسری اقوام کی ہماری بہنوں کی طرح اپنی حق تلفیوں کے دور کرنے کے لئے کوئی جدو جہد کرنے کی ضرورت ہے مسلمان عورتیں مردوں کے برابر حقوق کی حامل ہیں جوں ہی ایک مرتبہ توہمات کی جکڑ بندیاں دور ہو جائیں گی ۔ دنیا کی کوئی طاقت ان کی ترقی کو نہیں روک سکتی'

اس دعوے کے ساتھ ساتھ کہ گذشتہ بیس سال کی تاریخ ہمارے دلوں میں کسی قسم کی مایوسی پیدا نہیں کرتی اس کے ساتھ ہی مجھکو یہ بھی کہنا ہے کہ ابھی بہت کچھ کام کرنا باقی ہے۔ عورتوں کی تعلیم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت بدنظمی کی حالت میں ترقی کر رہی ہے' ہمارے ملک کا رائج الوقت نظام تعلیم جس کی بہت زیادہ نکتہ چینی ہو چکی ہے ایک اہم مسئلہ ہمارے سامنے پیش کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کے رائج کرنے کا مقصد سرکاری کام کے لئے موزوں ہندوستانی کلرک پیدا کرنا تھا اور یہی نظام تعلیم معمولی تبدیلی یا بغیر کسی تبدیلی کے علیٰ حالہٖ قائم ہے' اگر موجودہ نظام تعلیم مردوں کے لئے ناقص اور مہنگا ہے' تو عورتوں کے لئے اور بھی زیادہ ہے میرا خیال ہے کہ اس نظام کے غیر موزوں ہونے کے بارے میں اب دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ ہماری غیر مسلم بہنوں نے پچاس سال سے بغیر کسی خاص فائدہ کے اس پر عمل درآمد کیا۔ مسلمان لڑکیاں بھی انھیں کے قدم بہ قدم چل رہی ہیں وقت کا اہم اقتضاء ہے کہ پورے نظام تعلیم کو بالکل نئے سانچے میں ڈھالا جائے اور مسلمانوں کی مخصوص ضروریات کے ماتحت کوئی لائحہ عمل تیار کیا جائے۔ تاکہ لڑکیوں کا وقت اور ان کی قوت اور زیادہ ضائع نہ ہو'

کچھ عرصہ ہوا گورنمنٹ بنگال نے عورتوں کا ایک تعلیمی مشاورتی بورڈ بنایا تھا' جو اس خصوص میں ایک اہم اقدام ہے گورنمنٹ کی اس گہری دلچسپی کا پورا پورا اعتراف کرتے ہوئے جو وہ تعلیم نسواں بالخصوص مسلم لڑکیوں کی تعلیم میں ظاہر کر رہی ہے اور جن کو خاص توجہ اور نگرانی کی بالفعل ضرورت ہے ہمیں قوی امید ہے کہ یہ ضروری مسئلہ گورنمنٹ کے خاص غور و فکر کا مرکز بنے گا۔

جناب وائس چانسلر صاحب کلکتہ یونیورسٹی کو بھی ہم ہدیۂ مبارکباد پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے اسلامیات کا ایک شعبہ قائم کیا۔ ہم موصوف سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنی غریب بہنوں کو بھی فراموش نہیں کریں گے ہمارا یہ توقع کرنا کچھ ایسا نامناسب نہیں ہے کہ ہماری مخصوص ضروریات اور خواہشات پر وہ خاص توجہ مبذول فرمائیں گے'

مندرجہ بالا مقالہ کے علاوہ آنریبل مولوی ابوالقاسم فضل حق صاحب وزیر اعظم کی صاحبزادی صاحبہ کا حسب ذیل مقالہ پیش ہوا'

مسلمان خواتین اور مغرب پرستی

جناب صدر محترم و معزز حاضرین۔ آج یہاں جبکہ مسلمانانِ ہند کا اجتماع عظیم ہے، آج جبکہ ہماری صبح امید کی ایک جھلک سی نظر آتی ہے۔ آج جبکہ آپ سب کے سب ایک ہی یوسف مقصود یعنی ترقی اسلام کے حصول کے لئے جمع ہوئے ہیں اور جبکہ یہاں کتنے ہی صاحبان علم و ماہرین فن و اہل نظر حضرات جمع ہیں کیا ایک ناچیز ہستی کی کمزور و ناقص مگر دلدوز آواز کو سننا گوارا فرمائینگے؟ لیکن جبکہ ہمارے اسلاف میں یہ صفت موجود تھی کہ جب وہ اپنی شوکت و جلال کے خاص موقعوں پر بھی کسی ادنیٰ سے ادنیٰ ہستی کے اعتراضوں کو رد نہیں کرتے تھے تو پھر آپ کیوں نہ اس طرف متوجہ ہونگے؟

سنئے! آج جبکہ آپ سب ایک سے ایک بڑے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے آمادہ ہیں تو ناچیز بھی آپ کو آپ کا ایک اہم نکتہ یاد دلانا چاہتی ہے جس کی فراموشی کی بدولت ہی آج ہم اتنے پریشان و سرگرداں ہیں اور اگرچہ میں اپنی ناقابلیت کی وجہ سے اس کے کماحقہ اظہار کی اہل نہ بھی ثابت ہوں تاہم مجھے امید ہے کہ آپ میری تقریر کا مدعا سمجھ لینگے۔ میں یہ عرض کرنا چاہتی ہوں کہ آپ سب بحیثیت مسلمان ہونے کے اپنی تمام تجویزوں میں اپنے پیغمبر عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس زریں اصول کو نہ بھولئے جو انھوں نے آپ کی جماعت کے اس حصہ خاص یعنی آپ کی بانی حیات و ضامن نجات فرقہ مستورات کی اصلاح کے لئے پیش کیا ہے۔

کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ آپ اپنی تعمیرات کی بلندی پر ہرگز نہیں پہنچ سکتے جبتک کہ آپ اس کی بنیادوں کو کماحقہ مضبوط نہ بنالیں؟ کیا یہ غلط ہے کہ حیات انسانی اور غالباً بلا مبالغہ عالم موجودات میں فرقہ اناث ہی کی ذات اور اسی کا کمزور و ناقص ہاتھ بنیادی طور پر ہمیشہ کارفرما رہا ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ماں ہی کی عظیم الشان و بے مثال ہستی کہ جس کی خاموشی اور بے ساختہ محبت اور ایثار و قربانی و جاں نثاری کے مظاہرے تمہیں ہی کے دم قدم سے وابستہ ہیں وہ قدرت کی بہترین اور ... کی ہستی تعظیم حقیقت و عنایت کی آئینہ دار ہے وہ عورت ہی کی ذات ناقص و ناچیز تو تھی کہ جس کی ... باغ ارم کو بھی حضرت آدم کے لئے ناگوار بنا دیا تھا۔ اگر آج وہ آپ کی تاریخ ...

صرف سامان آرائش کے لئے ایک مسخ شدہ ہستی بن کر رہ گئی ہے وہ قابل قدر ہستی جو آپ کے ہادی برحق کے لئے یاد الٰہی کے ہم دوش محبوب و مطلوب تھی مگر آہ آج آپ کی غفلت و خود فراموشی اور تقلید یورپ کی تباہ کن گمراہی کی بدولت ایک گیسو بریدہ اور سرخی لب کی غیر فطری نمائش کی بدولت مثل ایک خونخوار درندہ کی صورت و سیرت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ آج ہماری وہ خاتونین جو کبھی اپنی خدا پرستی حیاداری جاں نثاری اور جفاکشی میں حضرت فاطمہ زہرا کے نقش قدم پہ چلنے والی رابعہ بصری و دیگر قابل فخر نمونے ملتی تھیں آج یورپ کی ملعون و مردود فضائے شیطانی میں خطرناک بگولے بنکر اڑ رہی ہیں۔ آج بجائے خاموش محبت و جاں نثاری سے گھروں کو زینت اور انسانیت کو امن و سکون بخشنے کے ہماری محترم و مقدس خاتونیں پردہ ساز کے ذریعے نفسانیت کو صلائے عام دے رہی ہیں۔ فیشن پرستی اور خود نمائی کے نگرہ اعلان سے اپنے اسلاف کی وہ فلک بوس قصر عزت و شان کو جس میں انہوں نے اپنی ہزارہا قربانیاں اور اپنی بے حساب جاں نثاریاں پیش کر کے اہل عالم کی نظروں کو چکا چوند کر دیا تھا، خاک ڈالکر پیروں تلے روندنا چاہتی ہیں، اور کہاں تک بتاؤں اور کیا گناؤں کہ آج مسلمان قوم کی تباہی میں اس فیشن زدہ بدنصیب طبقہ کا ہاتھ بھی کہاں تک شریک ہے۔ اور آپ معاف کریں کہ اس کے بانی مبانی بھی آپ خود ہی اے بزرگان قوم ہیں۔ کیا یہ غلط ہے کہ عورتیں اپنے وارثوں کی محتاج اور مقید ہوتی ہیں؟ کیا یہ غلط ہے کہ عورتیں ناقص العقل ہیں اور آپ کامل العقل ہیں؟ تو پھر کیا وجہ ہے کہ کامل نے ناقص کو نہیں سنبھالا؟ کیا آج مغرب کی اندھی اور بیجا تقلید کی بدولت ہماری مسخ شدہ مسلمانیت کی ابتدا عورتوں کی طرف سے ہوئی تھی؟ کیا پہلے عورتیں ولایت گئی تھیں اور وہاں سے غلط اور اندھی تقلید کے جراثیم لاکر یہاں پھیلائے تھے؟ کیا ہیم پسندی کا مظاہرہ لندن سے آتے وقت عورتوں کی طرف سے ہوا تھا؟ کیا مردوں نے سر توڑ کوشش عورتوں کو صورت و سیرت میں اونی سے اونی میم کی مشابہت میں کامل بنانے کے لئے نہیں کی؟ بھتیرے گھرانوں میں صرف اسی بنا پر زن و شوہر میں ناچاقی نہیں رہی کہ شوہر بیچاری کو بادوڈر اور تمام آرائشات مغربی سے مزین کر کے بے پردہ کلب یا جلسوں میں لیجانے میں ناکام رہتے تھے؟ کیا یہ سب طریقے اگر غلط تھے تو اس کا ذمہ دار کون ہے؟ اگر اندھی

تقلید ناجائز یورپ نوازی آپ کے نزدیک مفید ہے تو مجھے آپ سے کچھ شکایت نہیں کیونکہ ہر گمراہ کو سوائے خدائے پاک کے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا لیکن مجھے تو اس وقت ان سے کہنا ہے کہ جو مسلمان ہیں اور اس لئے اسلام کی ترقی کے خواہاں ہیں انہیں یہ سمجھنا چاہیئے کہ ترقی اسلام کی بھی ایک بنیاد ہے اور آپ غور سے دیکھئے کہ عورتیں اس میں کیا کر رہی ہیں۔ یا آپ اُن سے کیا کروا رہے ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ بنیاد اسلام و ایمان میں آپ کی عورتوں کے پاؤڈر کریم، لپ اسٹک، وغیرہ وغیرہ۔ جیسی چیزوں کی ضرورت ہے ؟ یا ان کی خدا پرستی جان نثاری خلوص و محبت کی مستحکم اینٹیں درکار ہیں ؟ کیا آجکل کی گریجوایٹ لڑکیوں میں سوائے ایک آدھ کے آپ وہ جفاکشی وہ ایثار وہ کسر نفسی پا سکتے ہیں جو اگلی جاہل اور تہذیب جدید سے بے بہرہ ہر محترم و مقدس خاتون اپنے اندر لازماً رکھتی تھیں تعلیم خود ہمارے شعار اسلام کا اصل اصول ہے۔ اسلام میں تعلیم کا اس سے بڑھکر اور کیا زور دار حکم ہو سکتا تھا کہ ہر مسلمان پر طلب علم فرض کیا گیا ہے اور مسلم سے مراد صرف مرد نہیں بلکہ ہر کلمہ گو عورت بھی برابر کی شریک ہے، لیکن خدارا یہ تو بتائیے کہ تعلیم سے ہمارے علم کے شوقین عالموں کی کیا یہی مراد تھی جو آج مسلمانوں میں بہت شد و مد سے جاری ہے ؟ کیا کبھی تعلیم میں علم دین یعنی تعلیم اسلام کا ذکر یا اسکی ذراسی کوشش یا ذراسی صورت بھی نکالی جاتی ہے ؟ کیا آجکل کی لڑکیوں کو کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے میں ذرا سا بھی موقعہ تعلیمات اسلام تک جانیکا ملتا ہے؟ نہیں! بلکہ انہیں خالص دنیاوی، یورپی تعلیم میں اس قدر مجبور و مدفون کر دیا جاتا ہے کہ انہیں خدا کے نام کو بھی زبان پر لانے یا دماغ میں سوچنے تک کی مہلت نہیں ملتی پھر ایسی تعلیم کے بعد کیسے ممکن ہے کہ عورتیں مسلمان بنکر ترقی کریں سوائے اس کے کہ بقول نواب سید محمد آزاد مرحوم و مغفور کے مغربی نسوان آزادی کی بگڑی ہوئی تصویر بنیں کیونکہ کوا گیا ہنس کی چال چلنے تو اپنی بھی بھول گیا۔ اور اسی قسم کی مضحک و قابل اعتراض روش رکھنے والی وہ ہستی ہے کہ جس کے ہاتھ میں حیات انسانی کی باگ ڈور ہے جو قومیت کے بانیوں کی پرورش کنندہ اور دل و دماغ عقل و فہم کی تیار کرنے والی یعنی عورتیں یا بالفاظ دیگر بنائے اسلام و انسانیت ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آپ ان کی طرف سے اس درجہ غافل ہیں ؟ اور آج اس مبارک موقعہ پر میں نے آپ کو اسے بزرگان قوم اس لئے مخاطب

کیا ہے کہ آپ جبکہ کلام الٰہی کی سند کے ساتھ عورتوں پر برتری و فضیلت رکھنے والے ہیں اور از روئے علم و عقل بھی ان کے نقص کے مقابلے میں کامل و اکمل ہیں۔ واقعتہً بھی آپ ہی مالک و وارث ہیں تو پھر کیوں نہ اس تدبیر کی ذمہ داری آپ سے متعلق ہو؟ اگر آپ چاہیں تو یقیناً اپنی بچیوں کو اور اپنی زیر اثر تمام مستورات کو غلط اور خطرناک رستے سے ہٹا کر اور بچا کر وہ راہ چلائیں جسے آپ اسلام و ایمان کی روشنی میں اچھا دیکھیں مناسب سمجھیں آپ عورتوں کے بارے میں بھی یاد رکھیں کہ ؎

خلاف پیغمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

امید ہے کہ ان ناچیز و حقیر معروضات کو آپ سب بقول ایک بزرگ کے کہ یہ نہ دیکھو کہ کون کہتا ہے بلکہ یہ سنو کہ کیا کہتا ہے غور فرما کر مجھے ممنون و شکر گذار کرینگے اور خود عنداللہ ماجور ہونگے کیونکہ اسی کی راہ میں چلنے کو یہ دور افتادہ کمزور آواز آپ تک پہنچی ہے۔

مندرجہ بالا مقالات کے بعد "شعبہ تعلیم نسواں" کے اجلاس میں حسب ذیل رزولیشن پیش ہو کر منظور ہوئے؛

رزولیشن نمبر ۱

"اس کانفرنس کی رائے میں ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کی معاشرتی و معاشی ضروریات کا اقتضا ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم میں مضمون خانہ داری کی طرف ایک خاص رجحان پیدا کیا جائے۔ اس لئے یہ کانفرنس مختلف تعلیمی بورڈوں، جامعات اور صوبہ واری حکومتوں سے حسب ذیل استدعا کرتی ہے؛

(الف) تمام مدارس کی ہر کلاس میں مضمون خانہ داری کی تعلیم کا انتظام کیا جائے اور اس مضمون کو طالبات کے لئے لازمی قرار دیا جائے۔

(ب) میٹریکولیشن کے نصاب میں ایسے کسی مضمون کی جگہ جس کا افادی پہلو لڑکیوں کے لئے نسبتاً کم ہو ہر لڑکی کے واسطے معاشیات خانہ داری کو لازمی قرار دیا جائے،

(ج) اُن طالبات کو جو معاشیات خانہ داری کا مطالعہ کرنا چاہیں یا اس میں اختصاص پیدا کرنا چاہیں اس کی اجازت ہو کہ وہ انٹرمیڈیٹ اور بی اے میں مضمون لے سکیں اور ہر زنانہ کالج میں اس کا انتظام کیا جائے۔"

محرک۔ پروفیسر محمد ہارون خاں صاحب شروانی۔

رزولیوشن نمبر۲

"یہ کانفرنس مسلم زنانہ مدارس میں دستکاری کی تعلیم اور عملی تربیت پر زور دیتے ہوئے اُن کے منتظموں سے استدعا کرتی ہے کہ وہ اس شعبہ کو زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کی طرف توجہ مبذول کریں، نیز یہ کانفرنس قرار دیتی ہے کہ زنانہ مدارس کے شعبہ دستکاری کے لیے سرکاری لوکل بورڈ اور پرائیویٹ امدادوں کا حتی الامکان انتظام کرے۔"

محرک۔ مسز حکیم صاحبہ،
مؤید۔ مولوی عبد الحمید صاحب تاجر کلکتہ،

رزولیوشن نمبر۳

"یہ کانفرنس اُن مسلم طالبات کا لحاظ کرتے ہوئے جو جونیر مدارس سے فارغ التحصیل ہوئی ہیں اور اُن کی آئندہ تعلیم کا انتظام نہیں ہے گورنمنٹ بنگال سے پُرزور درخواست کرتی ہے کہ وہ ڈھاکہ اور چٹاگانگ میں اعلیٰ تعلیم نسواں کے مدارس قائم کرے۔"

محرک۔ پروفیسر طاہر جمیل صاحب،
موئد۔ خانصاحب سید احمد رشید صاحب،

رزولیوشن نمبر ۴

"یہ کانفرنس گورنمنٹ بنگال سے سفارش کرتی ہے کہ انفرادی کوششوں کی ہمت افزائی کی غرض سے نیز تعلیم نسواں کو فروغ دینے کے لیے تمام مدارس نسوانی کو کافی مقدار میں مستقل اور غیر مستقل یکمشت مالی امداد سے لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے گورنمنٹ صنعت و حرفت اور سائنس کی تعلیم کو ہر دل عزیز بنائے" اور اُس میں سہولتیں بہم پہنچانے کے لئے کوشش کرے"۔
محرک۔ خان بہادر فضل قدیر صاحب ایم ایل اے،

رزولیوشن نمبر ۵

"یہ کانفرنس لڑکیوں کی تعلیم کے لئے ضروری سمجھتی ہے کہ صوبہ بنگال کے مسلمان جلد سے جلد ایک وظائف فنڈ قائم کریں جس سے مسلمان لڑکیوں کو وظیفہ دے کر پردہ کے اندر مدارس میں تعلیم دی جائے"،
محرک۔ مسز حکیم صاحبہ،
موئد۔ پروفیسر قمر صدیقی،

رزولیوشن نمبر ۶

"یہ کانفرنس ایم اے اوگرلس اسکول کلکتہ نے جو خدمات انجام دی ہیں اُن کا اعتراف کرتی ہے اور امید کرتی ہے کہ مسلمان اُس کی امداد کریں گے"

مندرجہ بالا رزولیوشنوں کے منظور ہونے کے بعد اجلاس ختم ہوا۔

تیسرا اجلاس عام

۳۰ دسمبر ۱۹۳۹ء بوقت ۸½ بجے شب

۸½ بجے رات کو اجلاس عام شروع ہونے پر خاکسار آنریری سکرٹری کانفرنس کی طرف سے حسب ذیل رزولیوشن پیش کیا گیا۔

رزولیوشن نمبر ۱

"آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا یہ اجلاس سفارش کرتا ہے کہ چونکہ واردھا تعلیمی اسکیم کو بحیثیت مجموعی مسلمان پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھتے ہیں اس لئے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ماہرین تعلیم کی ایک ایسی کمیٹی کا تقرر کرے جو ایک ایسی مکمل اور جامع تعلیمی اسکیم مرتب کرے جو اکثریت اور اقلیت دونوں قسم کے صوبوں کے مسلمانوں کے لئے قابل قبول ہو سکے اور انکی تمدنی اور جماعتی خصوصیات و امتیازات کو برقرار رکھنے میں ممد ہو۔

نیز یہ کانفرنس جناب صدر کو مجاز کرتی ہے کہ وہ حسب ذیل افراد سے تحقیقاتی کمیٹی کی رکنیت کے متعلق خط و کتابت کرکے پانچ ارکان کی ایک کمیٹی منتخب فرمائیں تاکہ نظام تعلیم کی ترتیب کے کام کا آغاز ہو جائے۔

(۱) عبداللہ یوسف علی صاحب لاہور۔
(۲) سر شیخ عبدالقادر صاحب لاہور۔
(۳) آنریبل عزیز الحق صاحب وائس چانسلر کلکتہ یونیورسٹی۔
(۴) ڈاکٹر اے ایف رحمان صاحب دہلی۔

(۵) ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب لاہور،
(۶) خان فضل محمد خاں صاحب حیدر آباد دکن،
(۷) ڈاکٹر عبد العزیز پوری صاحب علی گڑھ،
(۸) مولوی حاجی ابو الحسن صاحب سابق ڈائرکٹر تعلیم ریاست کشمیر غازیپور،
(۹) مولانا سید طفیل احمد صاحب سابق آنریری جائنٹ سکریٹری کانفرنس علی گڑھ،
(۱۰) پروفیسر عبد المجید صاحب قریشی ایم اے سکریٹری کمیٹی،

اس کمیٹی کے اختیارات یہ ہوں گے کہ وہ اپنی تحقیقات میں تمام تعلیمی مواد کو پیش نظر رکھتے ہوئے مختلف صوبجات کے مقامی حالات کا مطالعہ کرے اور مسلمانوں کی معاشی ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنی رپورٹ سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کی وساطت سے آئندہ سالانہ اجلاس کانفرنس کے سامنے پیش کرے لیکن اس کمیٹی کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ مختلف صوبجات میں مقامی کمیٹیاں مقرر کرا کے صوبجاتی حالات کی تحقیقات میں ان سے امداد حاصل کرے"

آنریبل مولوی ابو القاسم فضل حق صاحب وزیر اعظم بنگال نے اس رزولیوشن کی تائید کرتے ہوئے فرمایا،

جناب صدر و محترم برادران اسلام، یہ تحریک جو ابھی پیش کی گئی ہے ایک جامع تحریک ہے، جو مسلمانان ہند کے تعلیمی مسئلہ کے بارے میں نہایت اہم ہے، اس پر ایک مفصل جامع تقریر کی ضرورت ہے مگر بدقسمتی سے میں زیادہ دیر تک ٹھہرنے سے مجبور ہوں کیونکہ مجھے ایک ضرورت سے اس وقت کلکتہ سے باہر جانا ہے، اس لئے کسی تفصیل کے پیش کرنے سے معذور ہوں،

واردھا اسکیم کی خرابیوں کے بارہ میں مسلمانوں کا خیال جس قدر مضبوط و مستحکم ہے اس کا آپ کو ضرور اندازہ ہوگا، میں گزشتہ سال کانفرنس کے اجلاس پٹنہ کے موقع پر اپنے خطبہ صدارت میں واردھا اسکیم کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کر چکا ہوں اور اب اس موقع پر اس سے زیادہ اور کچھ کہنا نہیں چاہتا کہ اگر آپ نے یہ اسکیم منظور کر لی تو آپ کے لڑکے برائے نام مسلمان رہ جائیں گے جو فرقہ پرستی سے بھرے ہوئے ہوں گے، وردیا مندر اسکیم میں خواہ کوئی بات

مفید بھی ہو لیکن بہر حال اُس میں ایسی چیزیں بھی ہیں جو مسلمانوں کے مذہب اور خدا رسول کے احکام کے بالکل برخلاف ہیں،

اس کے بعد آنریبل وزیر اعظم نے صوبہ بنگال کی تعلیمی حالت کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ گزشتہ ڈھائی سال میں حسب گنجائش بجٹ میں کافی روپیہ ابتدائی تعلیم کے لیے رکھا گیا، نیز لڑکیوں کی تعلیم کا بھی بندوبست کیا گیا، ڈھاکہ اور چاٹگام میں بھی تعلیمی ترقی کے لئے کوشش کی گئی، پہلے جو ابتدائی نصاب رائج تھا وہ مسلمان لڑکیوں کی ضروریات و حالات کے خلاف تھا، لہذا ضرورت تھی کہ اس میں ترمیم کی جائے اس ارادہ پر کانگرسی اخبار والوں نے واویلا شروع کر دیا، اور طرح طرح سے جھوٹا پروپگنڈا کیا، مثلاً یہ کہا گیا کہ ہندو لڑکیوں کو بزور عربی و فارسی سیکھنے پر مجبور کیا جاتا ہے، یہ بھی کہا گیا کہ موجودہ وزارت پرائمری اسکولوں کو مکاتب کی صورت میں بدل رہی ہے، بلکہ یہ افترا پردازی بھی کی گئی کہ مسلمان اُستاد ہندو بچوں کو یہ تعلیم دیتے ہیں کہ گائے کا گوشت بہت لذیذ ہوتا ہے اور ہندو مذہب جھوٹا اور اسلام سچا ہے حالانکہ یہ جو کچھ کہا گیا محض جھوٹ تھا کسی مولوی صاحب نے یہ تعلیم نہیں دی،

سلسلہ تقریر میں آپ نے تعلیمی زبان کے متعلق بحث کی اور یہ بتایا کہ یہاں کی مادری زبان بنگالی ہے۔ اس کے بعد آپ نے زبان اور ماحول کے خطرات ظاہر کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر یہ حالت جاری رہی تو مسلمان بکرماجیت کو تو یاد رکھیں گے لیکن خلفائے راشدین کے نام سے واقف نہ ہوں گے بلکہ اندیشہ ہے کہ کہیں یہ نوبت نہ پہونچے کہ مسلمان بجائے قرآن مجید کے راماین پڑھنے لگیں، آج آپ فخر کرتے ہیں کہ بنگال میں تین کروڑ مسلمان بستے ہیں، لیکن ان میں کتنے ہیں جو درحقیقت پورے طور پر مسلمان ہیں جب کسی مسلمان میں ایسی باتیں دیکھتا ہوں جو اسلام کے خلاف ہیں تو سخت رنج ہوتا ہے یہ کیا ہے کہ نام عبدالوحید اور کام رام لچھمن کا، اگر تم مشرکانہ اور ہندوانہ کام کرتے ہو تو اپنا نام بدلو پھر اپنے کو بھی بدلو اور مسلمانوں کو بدنام نہ کرو، ہمیں اسلام کی فلاسفی سیکھنے کی ضرورت ہے، بندر کی فلاسفی نہیں، ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے کہ ہنومان اور بندر کے قصے سنیں،

حضرات! یاد رکھئے کہ خواہ آپ کتنی ہی جد و جہد کریں اور کتنی ہی کانفرنسیں منعقد کریں جب تک آپ کے درمیان اختلاف ہے کبھی کامیاب نہ ہوں گے اس۔ لئے سب سے پہلے مسلمانوں کو یہ احساس ہونا چاہیئے کہ وہ پورے طور پر منظم ہو جائیں اور متحد ہو کر کام کریں،

گورنمنٹ سے یہ توقع رکھنا کہ وہ روپیہ پیسہ سے آپ کی مدد کرے گی بالکل بے بنیاد بات ہے البتہ کبھی آپ کو کچھ مل جائے گا، جبکہ آپ کی مجارٹی ہو گی اور بول بالا ہو گا۔ یہ کس قدر دردناک مصیبت ہے کہ کسی معاملہ میں بھی مسلمان متحد نہیں ہیں، پچاس ایک طرف ہیں تو پچاس دوسری طرف، اسمبلی کے اندر اور باہر سب جگہ یہی حالت ہے، بہار اور پٹنہ میں جانے کا اتفاق ہوا دیکھا کہ وہاں بھی یہی حالت ہے کہ مسلمان بہت سے فرقوں میں تقسیم ہیں، ایک جگہ ۹ ممبر میں صرف ۲ ہندو ہیں اور ۷ مسلمان مگر چیرمین ہندو تھے، وجہ یہ ہے کہ مسلمان ہم خیال نہیں تھے بلکہ وہ تین فرقے ہو گئے کہتے ہیں کہ ہم دوسرے لوگوں کے فریب میں آگئے ہیں کہتا ہوں کہ باہم کیوں فریب میں آجاتے ہو،

مسلمانو! میں کہتا ہوں کہ اصلی چیز اپنی قوت بازو ہے، خدا کے بعد اپنی ذات پر اعتماد کرو، اگر دوسروں سے امید باندھو گے تو تمہیں مایوسی ہو گی، یاد رکھو اللہ تعالیٰ ہر شخص کو ایک موقع دیتا ہے اگر وہ موقع کھو گیا تو سمجھو کہ گیا، ہمیشہ یہ موقع ہاتھ نہیں آتا، اسوقت بنگال میں آپ کو موقع ملا ہے، اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ، اور اپنی ترقی کے لئے کچھ کرو، شاید پھر یہ موقع نہ ملے،

اس کے بعد سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے آپ نے مسلمانان بنگال کی تعلیمی حالت پر مختصر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ کیسی پستی کی حالت میں ہیں، اور اب تک دوسروں سے پیچھے ہیں، مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کے لئے ڈھائی لاکھ روپیہ کا بندوبست کیا گیا، مگر مسلمان خود کچھ نہیں کر سکتے کہتے ہیں کہ ہم غریب ہیں فیس نہیں ادا کر سکتے کوئی مسلمان اس بارہ میں مالی امداد دینے کے لئے تیار نہیں، میں نے بہت کوشش کی، محنت کی، مگر اس کا کوئی حل نہ کر سکا، ضرورت ہے کہ اس کی تشخیص کی جائے کہ مسلمانوں کا اصلی مرض کیا ہے،

مسلمان اگر غریب ہیں تو غریب ہونا کوئی عیب نہیں، پہلے بھی لوگ غریب تھے مگر وہ خدا پر بھروسہ کرتے تھے، اور کوشش میں دریغ نہیں کرتے تھے، آپ بھی یہ کوشش کیجئے کہ سب مسلمان آپس میں مل کر ہر ضلع میں ایک ایجوکیشنل فنڈ قائم کریں، اور اس کے ذریعہ سے مسلمان بچوں کی تعلیم میں امداد کریں غرض یہ ہے کہ خود اپنے قوت بازو سے کام لیجئے اور گورنمنٹ پر کم بھروسہ کیجئے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ گورنمنٹ پر آپ کا حق نہیں ہے، لیکن جب تک آپ خود کوشش نہ کریں گے کچھ نہ ہو گا۔ اس کو پورے طور پر سمجھ لیجئے، افسوس ہر معاملے میں دیکھئے مسلمان نہایت پیچھے ہیں، پہلی دفعہ جب بنگال کی کانفرنس ہوئی تو میں والنٹیر کی حیثیت سے حاضر تھا اس وقت سے ہی رونا سن رہا ہوں کہ مسلمان

کچھ نہیں کرتے مسلمان تعلیم میں پسماندہ ہیں، اور ہر چیز میں سب سے پیچھے ہیں،

مسلمانوں کی اسی ناگفتہ بہ حالت کی وجہ سے میں اس ررزولیوشن کی تائید کرتا ہوں، لیکن میں پھر کہتا ہوں کہ سب سے پہلے مسلمانوں کو آپس میں اتحاد پیدا کرنا چاہئے اور یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ہمارا کوئی دوست نہیں ہے، انگریز بھی اپنی غرض کو لیکر بیٹھا ہے وہ بھی کبھی ہمارا دوست نہیں ہوسکتا، اگر کبھی وہ ہمارے لئے کچھ کرتا ہے تو یہ "حُبِ علی" نہیں بلکہ "بغضِ معاویہ" والی بات ہے، وہ اسٹیٹسمین جو ہمیشہ میری مخالفت کرتا تھا آج کبھی کبھی تائید کر دیتا ہے گویا ایک ہی قلم سے مخالفت بھی اور موافقت بھی لیکن میں ان مخالفین کی مذمت یا تائید سے ذرا بھی اثر نہیں لیتا کیونکہ سب کچھ غرض پر مبنی ہے، یہی حالت ہندو کی بھی ہے، اس لئے مسلمان کو کسی سے بھلائی کی امید نہ رکھنی چاہئے صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنا چاہئے، جب مسلمان کام کرنے کے لئے تیار ہوگا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید ہوگی اور اسی کے فضل سے کام ہوگا، صرف ایمان کی مضبوطی درکار ہے اسی سے کام بنے گا، اسلام کے باہر ہم کسی سے کوئی امید نہیں رکھ سکتے مجھے تو اس کا تجربہ ہے کہ سخت مصائب و مشکلات کی حالت میں جب دوسروں سے امید رکھی تو کوئی بھی کام نہ آیا، لیکن جب غیروں پر بھروسہ چھوڑ دیا اور اپنے خدا سے التجا کی اور رات بھر اس کے سامنے رویا تو اس کی تائید غیبی سے سب مشکلیں حل ہوگئیں، اس لئے ہمیں اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہئے اس سے بڑھ کر مسلمانوں کا حامی و مددگار کوئی نہیں ہے، مسلمانوں کو کسی سے نہیں ڈرنا چاہئے یہاں تک کہ موت سے بھی نہیں ڈرنا چاہئے کیونکہ مرنا تو بہرحال ایک دن ہے، اس لئے میں آپ سے کہتا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی پر اعتماد نہ کیجئے آپ جب دنیوی حکام پر اعتماد کرتے ہیں تو اکثر ناکام رہتے ہیں، میں عموماً یہ شکایت سنتا ہوں کہ کلکٹر نے یہ نہیں کیا اور وہ نہیں کیا، میں کہتا ہوں کہ اس کی کیا شکایت، حکام ہمیشہ ایک خاص پالیسی پر عمل کرتے ہیں، اور پالیسی بدلتی رہتی ہے، جب پالیسی بدل جاتی ہے تو ان کا طرزِ عمل بھی بدل جاتا ہے اس لئے تم صرف اللہ پر بھروسہ رکھو جو کسی پالیسی کے مطابق [illegible] نہیں کرتا، مسلمانوں کی فلاح جب کبھی ہوگی اسی طرح ہوگی،

مسلمانوں کو دوسروں کے اثر سے اور [illegible] [illegible] آپ [illegible] سکیم کو منظور [illegible] دینا چاہئے تو ان کے لئے [illegible] اور [illegible] میں اس رزولیوشن کی تائید کرتا ہوں [illegible]

مسلمان اس کی تائید کریں گے، مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ متحد ہو جائیں اور آپس میں مل کر کام کریں، واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا،

آنریبل فضل حق صاحب کی تائید کے بعد رزولیوشن بالاتفاق منظور ہوا،

اس کے بعد خان بہادر فضل قدیر صاحب نے حسب ذیل رزولیوشن پیش کیا،

رزولیوشن نمبر ۲

"آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا یہ اجلاس نہایت زور کے ساتھ سفارش کرتا ہے کہ صوبہ بنگال کی قدیم پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو زندہ کیا جائے اور سردست آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی جنرل اسٹینڈنگ کمیٹی کے اُن ممبروں کو جو صوبہ ہذا سے متعلق ہیں پراونشل کانفرنس کا ممبر قرار دے کر چند ممبروں کا اضافہ کیا جائے جو ایک سکرٹری کو منتخب کر کے جلد سے جلد کام شروع کر دیں۔"

ابو المظفر احمد صاحب ٹریژرر ڈھاکہ یونیورسٹی نے اس رزولیوشن کی تائید کرتے ہوئے فرمایا کہ پراونشل کانفرنس کا قیام صوبہ بنگال کے لئے نہایت مفید ثابت ہوگا اس لئے میں اس رزولیوشن کی تائید کرتا ہوں، ضرورت ہے کہ یہ کانفرنس جلد قائم کی جائے اور ہر سال صوبہ کے کسی ضلع میں اس کا سالانہ اجلاس ہوا کرے،

تحریک و تائید کے بعد رزولیوشن بالاتفاق پاس ہوا،

اس کے بعد مظہر علی صاحب ایڈوکیٹ نے جناب صدر کی اجازت سے اپنا ایک مقالہ پڑھا، مقالہ کے بعد ڈاکٹر عبد العزیز صاحب پوری نے ایک مختصر تقریر کی جس میں یہ بتایا کہ یورپ کے مورخین نے اسلامی عہد کی تاریخ لکھتے ہیں کس قدر غلط کاری اور تعصب سے کام لیا ہے،

مندرجہ بالا تقریر کے بعد پروفیسر عبد القادر صاحب ایم اے نے صوبہ سرحد کی تعلیمی حالت کے متعلق ایک مختصر تقریر کی جس میں قبائل کی ذہنی کیفیت اور صوبہ کی پوزیشن ظاہر کرتے ہوئے یہ بتایا کہ پٹھانوں میں تعلیم حاصل کرنے اور ہر شعبہ حیات میں ترقی کرنے کی کس قدر صلاحیت و استعداد ہے، سلسلہ تقریر میں آپ نے اس رزولیوشن کا بھی ذکر کیا جو آج صبح کے اجلاس میں منظور ہوا تھا اور جس میں اس صوبہ کے لئے ایک علیحدہ یونیورسٹی کی ضرورت ظاہر کی گئی تھی،

آپ نے بتایا کہ صوبہ سرحد کی تعلیمی ترقی کے لئے ایک علیحدہ یونیورسٹی کی (جو خیبر یونیورسٹی کے نام سے موسوم ہو) شدید ضرورت ہے، اگر پٹھانوں نے جدید تعلیم میں ترقی حاصل کرلی تو یہ خود حکومت کے لئے بھی مفید ہوگا،

پروفیسر صاحب کی تقریر کے بعد جناب صدر نے مقررین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس وقت کے اجلاس کے ختم ہونے کا اعلان کیا،

اجلاس شعبہ اردو

صدر۔ مولانا سید سلیمان ندوی

۳۱۔ دسمبر ۱۹۳۹ء کو بوقت ۹½ بجے صبح شعبہ اردو کے اجلاس کا آغاز تلاوت **کلام مجید** سے ہوا، اس کے بعد خاکسار آنریری سکرٹری کانفرنس نے مولانا سید **سلیمان** صاحب ندوی کے لئے تحریک صدارت کرتے ہوئے عرض کیا،

حضرات! میں صدارت کی تحریک کرنے کے لئے کھڑا ہوا ہوں اس تحریک کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ صدر کے فضائل وکمالات بیان کئے جائیں، لیکن جن صاحب کے لئے میں تحریک صدارت کر رہا ہوں وہ میرے چھوٹے ہیں اس لئے میں ان کی بزرگی اور فضائل نہیں بیان کرسکتا، میں نے انھیں اُس وقت دیکھا جب وہ چھوٹے سے تھے لیکن علم کا شوق اُس وقت بھی تھا اور اس کے بعد بھی برابر علم ہی کی خدمت کرتے رہے، اب وہ سفید ریش ہیں اور بزرگوں کے بھی بزرگ معلوم ہوتے ہیں،

حضرات! سید سلیمان صاحب کی قابلیت اس سے ظاہر ہے کہ جب مولانا **شبلی** مرحوم بستر مرگ پر تھے تو سیرۃ نبوی کی تکمیل کے لئے انھیں کو وصیت کی، اور جب مولانا شبلی کی رحلت ہوئی تو سیرت لکھنے کے لئے ملک کی نظریں انھیں پر پڑیں، بیگم صاحبہ مرحومہ بھوپال سیرت کی تالیف کے سلسلہ میں مالی امداد دے رہی تھیں اس لئے دربار بھوپال میں بھی یہ سوال پیدا ہوا کہ سیرت کون لکھے؟ سید سلیمان صاحب بھوپال بلائے گئے، اور سیرت نبوی کی تکمیل کے لئے موزوں سمجھے گئے چنانچہ سیرت کی چھ جلدیں اُن کے اہتمام سے شائع ہوچکی ہیں، آج بھی وہ دار المصنفین کے روح رواں

ہیں اور اس کے ذریعہ سے علم کی اور اُردو زبان کی خدمت میں مصروف ہیں، اس لئے وہ اس اجلاس کی صدارت کے لئے نہایت موزوں ہیں، لہذا میں نہایت خوشی سے ان کی صدارت کے لئے تحریک کرتا ہوں"

خاکسار آنریری سکرٹری کی تقریر کے بعد مسٹر عبدالرحمٰن صدیقی ایم ایل اے (بنگال) نے تحریک صدارت کی تائید کرتے ہوئے فرمایا کہ مولانا سید سلیمان صاحب کے متعلق جو باتیں کہنے کی تھیں وہ نواب صاحب نے کہہ دیں، مولانا سید سلیمان صاحب، علامہ شبلی نعمانی کے صحیح جانشین ہیں اور انھوں نے اردو کی ایسی شاندار خدمت کی ہے جو کبھی نظرانداز نہیں کی جاسکتی، لہذا میں اس تحریک کی تائید کرتا ہوں"

تحریک و تائید کے بعد مولانا سید سلیمان صاحب ندوی صدارت کی کرسی پر تشریف لائے شعبہ اُردو کے سکرٹری مولوی رشید احمد صاحب صدیقی ایم اے بعض موانع کی وجہ سے اجلاس کانفرنس میں شریک نہیں ہو سکے تھے اس لئے سید الطاف علی صاحب ہیڈ اسسٹنٹ کانفرنس نے شعبہ اردو کے مختصر حالات بیان کئے، جس میں یہ بھی بتایا کہ "انجمن ترقی اردو" پہلے کانفرنس ہی کا ایک شعبہ تھا جو مولوی عبدالحق صاحب کی سعی و کوشش سے ترقی کر کے اب ایک مستقل انجمن کی صورت اختیار کر چکا ہے اسی سلسلہ میں مقرر نے مختصر طور پر ان خدمات کا تذکرہ بھی کیا جو کانفرنس نے اُردو کے متعلق انجام دی ہیں"

اس کے بعد مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے اپنا پرمغز خطبہ صدارت پڑھا جس کا ایک ایک لفظ توجہ سے سنا گیا، یہ خطبہ ذیل میں ملاحظہ کیجئے"

خطبہ صدارت جناب مولانا سید سلیمان صاحب ندوی

اختلاف و اتحاد

ہم بانو! ممنون ہوں کہ آپ نے اپنی محفل کی صدارت کی عزت دے کر اپنی زبان کی خدمت کا ایک موقع عنایت فرمایا۔ آج کل نہ صرف دنیا ایک نازک دور سے گذر رہی ہے، بلکہ خود ہمارا ملک بھی ایک ایسے پُرخطر زمانہ سے گذر رہا ہے کہ اگر مسلمانوں نے تھوڑی سی غفلت برتی تو پھر اس نقصان کی تلافی صدیوں میں بھی نہیں ہو سکتی، ہم خیالات میں کتنے ہی مختلف ہوں مگر اس بارہ میں ہم میں سے ایک کو بھی اختلاف نہیں کہ ہم کو اس ہندوستان میں مسلمان ہی ہو کر جینا اور مسلمان ہی ہو کر مرنا ہے۔ البتہ یہ خیال ہمارے ساتھ ہے کہ ہم ہندوستانی

مسلمان ہیں۔ اس لئے ہم پر جس طرح بحیثیت مسلمان ہونے کے فرائض ہیں بحیثیت ہندوستانی ہونے کے بھی ہم پر کچھ حقوق ہیں۔ اور جہاں تک ہو سکے ان فرائض اور حقوق کے دوہرے بوجھ کو اٹھا کر ہی آگے کو چلنا ہے اور ایسی کوشش کرنا ہے کہ ان دونوں میں ایسی ٹکر نہ ہو جو دونوں کو پاش پاش کر دے۔ اور اگر ایسا موقع آ ہی جائے تو بہر حال دین و دنیا کی بہتری کا خیال صرف دنیا کی بہتری کے خیال پر ترجیح پائے گا۔

اتفاق و اتحاد کی طرف مسلمانوں کا پہلا قدم

ہم مسلمانوں نے اس مشکل کو اسی دن سمجھ لیا تھا جس دن اس سرزمین پر پہلے دن پاؤں رکھا تھا۔ یہ اسی رواداری اور صلح جوئی کا نتیجہ تھا کہ مسلمان اس ملک میں خواہ عرب سے آئے۔ ترکستان اور خراسان سے آئے، ایران سے آئے۔ افغانستان سے آئے مگر یہاں آکر نہ وہ عرب رہے نہ ترک رہے۔ نہ ایرانی رہے اور نہ افغانی۔ خالص ہندوستانی ہو گئے۔ عربوں نے عربی۔ ترکوں نے ترکی۔ ایرانیوں نے فارسی۔ اور افغانیوں نے پشتو چھوڑ کر اسی دیس کی بولی اپنی بولی بنا لی۔ اور ایسی بنا لی کہ وہ اس زبان میں شاعری اور انشاء پردازی کرنے لگے۔ اردو تذکرہ کی کتابوں میں بیسیوں ایسے شاعر ملیں گے۔ جن کے حال میں لکھا ہو گا کہ اُن کے باپ دادا عرب' ایران اور ترکستان سے آئے۔ مگر وہ خود اسی ملک کی زبان بولنے اور اس میں دادِ سخن دینے لگے'

اردو ہندی کی تفریق

آج ہمارے دیس کی جو بولی ہے اور جس کو آج سب ہندوستانی بول رہے ہیں وہ اسی دیس کی پیداوار ہے۔ وہ عرب' ایران' ترکستان' سے نہیں آئی۔ فرق اتنا ہے کہ مسلمانوں نے اپنی زبانوں کے کچھ لفظ اس میں ملا دیئے۔ اور ایسا ہونا ضروری تھا۔ زبان بولنے والوں کی ضرورتوں کا آئینہ ہوتی ہے۔ اس لئے مختلف قوموں کے درمیان ان قوموں کی مختلف ضرورتوں کی بناء پر اختلافات ہونا ضروری ہے۔ ایسے اختلافات سے ایک زبان دو نہیں بن جاتی۔ مسلمانوں کا ایمان' ایمان ہی ہے۔ اور ہندوؤں کا دھرم دھرم ہی رہے گا۔ ہمارا مذہبی فاقہ روزہ کہلائے گا۔ اور ان کا برت۔ ہم حج اور زیارت کرتے ہیں۔ اور وہ تیرتھ۔ ہمارا مردہ جنازہ ہوتا ہے۔ اور اُن کا ارتھی۔ ہم مر کر "جنت" میں جاتے ہیں۔ اور وہ "بیکنٹھ" لیکن اس اختلاف کو اتنا بڑھانا کہ ہم پانی پئیں اور وہ جل۔ ہم "اور" کہیں اور وہ "تتھا" اور ایسے ہی اختلافوں کو اور بڑھا بڑھا کر ایک بولی کو دو بنانے کی کوشش کرنا ہمارے نزدیک مسلمانوں کا جرمِ عظیم اور ہندوؤں کا مہا پاپ ہے۔

ہندوستان کی اس زبان کے بنانے میں دونوں کا حصہ

یہ زبان جس کو ہم ہندو مسلمان آج بول رہے ہیں۔ یہ آج نہیں ایک ہزار برس میں بنی ہے۔ اس کے بنانے میں ہندو مسلمان بزرگوں کی ایک ہزار برس کی عمر بیتی ہے۔ یہ ہندوستان میں ہندو مسلمان سمجھوتہ کی سب سے بڑی یادگار ہے جو لوگ اس زبان کو مٹانا چاہتے ہیں وہ ہندو مسلمانوں کے تعلقات کو نئے سرے سے پھر الجھانا چاہتے ہیں۔ اور ایک ہی ملک۔ بلکہ ایک ہی صوبہ۔ بلکہ ایک ہی شہر۔ بلکہ ایک ہی گاؤں میں دو ایسی برابر کی قومیں پیدا کرنا ہے جو ایک دوسرے کی زبان نہ سمجھ سکیں۔ اور جب ایک دوسرے کی زبان نہ ملے گی تو دل کیا ملے گا۔

یہ زبان بدیسی نہیں

ہندو بھائیوں کے ایک طبقہ میں اس زبان کے خلاف جو جذبہ کام کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ یہ زبان بدیسی ہے۔ اور قومیت پروری کا اقتضا یہ ہے کہ ہم اپنے دیس کی بولی بولیں۔ اور بدیسی بولی کو چھوڑ دیں۔ حالانکہ ہندوستان کی کوئی زبان چند بدیسی عربی اور فارسی لفظوں کے مل جانے سے عربی اور فارسی نہیں بن جائے گی جیسے چند انگریزی لفظوں کے ملنے سے انگریزی نہیں بن جاتی۔ اگر ہم کو بدیسی سے ایسی چڑ ہے تو پہلے یہاں سے مسلمانوں کو نکالنا چاہیے بلکہ عیسائیوں کو نکالنا چاہیے۔ پارسیوں کو نکالنا چاہیے انگریزی علوم کو نکالنا چاہیے۔ تمام یوروپین ایجادات اور وہاں کی مصنوعات سے ملک کو خالی کر دینا چاہیے۔ بلکہ خود سنسکرت کو یہاں سے خارج کیجئے کہ وہ بھی سنٹرل ایشیا سے آئی ہے اور برہمنوں کو بھی نکالیے کہ وہ بھی باہر سے آئے ہیں۔

دو راہیں

صاحبو! راہیں دو ہیں۔ ایک یہ کہ ہم یہ سمجھیں کہ ہندوستان خالص ہندوؤں کا ملک ہے اس میں جو کچھ ہو وہ خالص ہندوانی ہو زبان وہی ہو لباس وہی ہو تعمیر وہی ہو۔ مذاق وہی ہو۔ علم و فن وہی ہوں۔ اور جو بھی اس ملک کی چہار دیواری کے اندر ہے وہ اسی کا محکوم ہو کر رہے۔ یہ راہ بحد خطرناک اور مشکلوں سے بھری ہوئی ہے۔ اور اس راہ کی کامیابی میں بہت کچھ شک کیا جا سکتا ہے۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ ہم یہ سمجھیں کہ ہندوستان ایک گلدستہ ہے جس میں طرح طرح کے پھول کھلے ہیں۔ ع

"ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است"

لیکن رنگ و بو کے اس اختلاف کے باوجود وطن خواہی کے دھاگے نے ان سب کو ایک جگہ باندھ کر ایک بنا دیا ہے۔ یہ وہ راستہ ہے جس پر چل کر ہندوستان کی ہر چھوٹی بڑی قوم زندہ

رہ سکتی ہے۔ اور کل کا جزو بن کر کُل کی طاقت کا باعث ہو سکتی ہے۔

تنگ خیالی کے بُرے نتیجے

میرے نزدیک کسی ہندو طبقہ کا قومیت اور وطنیت کے مفہوم کو اتنا تنگ سمجھنا کہ خود اس ملک کے رہنے والے بھی وہاں کے اصلی رہنے والے ثابت نہ ہو سکیں۔ ان کی وہی موروثی اور پرانی تنگ خیالی ہے جس نے تاریخ میں ان کو ہمالیہ اور سمندر کی چار دیواری میں ہندا اور چھوت اچھوت کی پرانی لڑائی ہزاروں برس سے کھڑی کر رکھی ہے۔ اور جس نے تاریخ کے ہر دور میں ان کے اندر نفاق پیدا کیا ہے۔ اور انھیں کے اندر کے مظلوم فرقوں کو مجبور کیا ہے کہ وہ باہر کا سہارا ڈھونڈھیں۔ اور باہر والوں کو اپنی مدد کے لیے اپنے گھر بلائیں۔ اور نتیجہ میں اپنے ساتھ دوسروں کو بھی غلامی کی زنجیروں میں اسیر کرائیں۔ یہ ایک تاریخی نکتہ ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں لیکن جس کو کسی موقع پر کبھی بھولنا نہیں چاہئے۔

یہ زبان دونوں کی ہے

اس زبان کو جو اس وقت ملک کے بڑے حصہ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے خالص اسلامی بولی سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے۔ یہ ہندو مسلمانوں دونوں کی محنتوں اور کوششوں سے بنی اور پروان چڑھی ہے۔ جو حقیقت ہے لیکن اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش برابر جاری ہے۔ لیکن حقیقت کی سچائی چھپائے نہیں چھپ سکتی۔ ہم خود بھی اس غلطی میں تھے کہ شاید نہیں چالیس برس کی لگاتار کوششیں اس حقیقت پر پردہ ڈال چکی ہیں۔ مگر پچھلے سال اردو دن منانے کی جو تحریک ہوئی اور اس میں پنجاب سے لیکر بہار تک کے مسلمانوں کے ساتھ ہندو دوستوں نے بھی جو دلچسپی لی اور جو تقریریں کیں ان سے یہ پتہ چلا کہ یہ زبان ملک کی زبان ہی پر نہیں بلکہ دل میں بھی اُتر چکی ہے۔ اور حقیقت سمجھنے والے ہندو دوست بھی اس کی سچائی کو دل سے مانتے ہیں۔ اور اسی کو اپنی مادری زبان جانتے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ سر تیج بہادر کی وہ فاضلانہ تقریریں جو الہ آباد لکھنؤ، پٹنہ، حیدر آباد اور ابھی کشمیر میں ہوئیں۔ ان سے ہم کو پوری طرح یقین ہوتا ہے کہ ملک میں بہت سے ایسے سمجھدار ہندو ہیں جو سچائی کے ساتھ اس حقیقت کو مانتے ہیں اور ایمانداری کے ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ سنسکرتی ہندی کے خواہشمند در اصل ملک کے باشندوں کے درمیان تفریق اور عناد کا بیج بو رہے ہیں۔

سنسکرتی ہندی اس ملک کی زبان نہیں

الہ آباد یونیورسٹی کے لائق وائس چانسلر پروفیسر جھا نے

ابھی چند مہینے ہوئے گوالیار میں ایک تقریر فرمائی ہے جس میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ سنسکرتی ہندی ہی ہندوستان کی عالمگیر زبان بن سکتی ہے۔ یہ خیال واقعات اور عملی سیاسیات سے قطع نظر کر کے ظاہر کیا گیا ہے اور سمجھا گیا ہے کہ گویا ہندوستان میں آریہ برہمنوں کے سوا اور کوئی قوم نہیں بس رہی ہے یہ خیال مدراس اور دکن میں ظاہر کیا جاتا تو پروفیسر صاحب کو معلوم ہو جاتا کہ یہ واقعات کی منطق سے کس قدر دور ہے۔ وہاں کی دراوڑی قومیں جو تامل تلگو اور کنڑی بولتی ہیں وہ ہندی پرچار کی اسی لئے مخالف ہیں کہ وہ سمجھتی ہیں کہ ہمارے دشمن آریہ برہمن اس بہانہ سے ہماری زبانوں کو اور کلچر کو مٹانا چاہتے ہیں جب یہ خیال ایک ایسے طبقہ کا ہے جو مذہب کی رو سے گویا ہندو ہی ہے تو ملک کے اس طبقہ کا یہ خیال کیوں نہ ہو جو اتحاد وطن کے علاوہ ہر حیثیت سے اُن سے الگ ہے۔

اقلیت کی زندگی کے ستون

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ زبان اسلامی زبان ہے تب بھی یہ کوئی کہہ نہیں سکتا کہ اقلیت والی زبان کے چل جانے سے اکثریت والی قوم کا رواج وتمدن اور تہذیب مٹ جائے گی۔ اکثریت اپنی اکثریت کے بل بوتے پر ہمیشہ قائم رہے گی۔ جیسا کہ اب تک قائم رہی ہے۔ لیکن اقلیت اگر اپنی زبان وادب چھوڑ کر اکثریت کی اُس زبان کو اپنی زبان بنا لے جس کے بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے تو اقلیت کے خاتمہ میں تو کوئی شک ہی نہیں رہ جاتا کیونکہ اقلیت کی انفرادی زندگی کی عمارت تو اسی قسم کے ستونوں پر کھڑی رہ سکتی ہے۔ پنجاب کے ایک ہندو پروفیسر نے یہ بات خوب کہی ہے کہ اردو مادری زبان کی حیثیت سے تو اسی ملک میں بولی جاتی ہے جہاں ہندو آبادی کی اکثریت ہے یعنی انبالے سے لیکر بھاگلپور تک اور جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے جیسے کشمیر، صوبہ سرحد، سندھ، پنجاب اور بنگال وہاں کے ہر ایک صوبہ میں اسی صوبہ کی زبان انکی مادری زبان ہے۔ کشمیر کے مسلمان کشمیری سندھ کے سندھی، سرحد کے پشتو، پنجاب کے پنجابی، اور بنگال کے بنگالی بولتے ہیں۔ اس لئے اس زبان کو اسلامی کہنے کے بجائے ہم ہندوہی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن باوجود اس کے مسلمانوں نے اس زبان کو قومی اور ملکی یکرنگی کی خاطر اپنی قومی اور ملکی زبان بنا یا ہے اور چونکہ صدیوں سے اس کو اپنی عمومی زبان بنا چکے ہیں۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ اب اس کی جگہ کسی دوسری زبان کو دی جائے۔

صوبہ وار بولیوں میں ہندو اور مسلمان کی یکساں بولی نہیں

یہاں پر اس غلطی کو بھی کھول دینا چاہئے

جو اکثر لوگوں کی زبانوں سے نکل جاتی ہے کہ ان صوبوں میں جہاں صوبہ کی الگ الگ بولیاں ہیں مسلمان اور ہندو ایک ہی بولی بولتے ہیں۔ جیسے بنگال میں بنگالی مسلمان اور بنگالی ہندو ایک ہی زبان بولتے ہیں۔ ایسے ہی گجرات میں گجراتی اور مرہٹہ میں مرہٹی۔ اور مدراس میں کنڑی اور تلگو وغیرہ دونوں قومیں یکساں بولتی ہیں۔ مگر یہ بات سچ بھی ہے اور جھوٹ بھی۔ سچ تو یہ ہے کہ بے شبہ ان زبانوں کے فعل اور حرف تو وہاں کے ہندو اور مسلمان ایک ہی بولتے ہیں۔ مگر اسما میں ان دونوں قوموں میں اتنا ہی فرق ہے جتنا ان کے تمدنوں اور ضرورتوں یا پچھلی روایتوں میں۔ ایک مسلمان بنگالی پروفیسر نے مجھے بتایا کہ مسلمان بنگالی پانی بولے گا اور ہندو بنگالی جل۔ مسلمان بنگالی خالہ کو کھالا کہے گا اور ہندو بنگالی موسی۔ وغیرہ۔ اور گجرات اور مرہٹی کا تو مجھے ذاتی تجربہ ہے کہ مسلمانی گجراتی۔ پارسی گجراتی۔ اور ہندو گجراتی میں اتنا ہی فرق ہے جتنا ان کی قوموں میں۔ یہی حال مرہٹی کا ہے کہ مسلمان مرہٹی ہندو مرہٹی سے امتیاز رکھتی ہے۔ یہی بات مدراس کی ہندو مسلمان بولیوں میں ہے۔ اور ایسا ہونا قدرتی بات ہے۔ ہمارے نزدیک اردو اور ہندی میں بھی اتنا ہی فرق ہونا چاہئے۔ اس سے زیادہ نہیں۔ لیکن اس سے آگے بڑھ کر یہ کہنا اور یہ سمجھنا کہ سنسکرتی ہی ہندی ہماری اصلی بولی ہونی چاہئے۔ دیس کے اتحاد اور یکتا کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا ہے۔

بعض تنگ خیال ہندو صحاب

ابھی پہلی اکتوبر ۱۹۳۹ء کے پانیر میں الٰہ آباد یونیورسٹی کے سنسکرت ریڈر پروفیسر سکسینہ کا جو مضمون ہندوستانی زبان پر نکلا ہے وہ اُن کے طبقہ کے خیال کا پورا آئینہ ہے۔

صوبہ یوپی کے سابق وزیر تعلیم نے اسمبلی کی ایک تقریر میں خوب کہا کہ نہ ہندو تمدن نہ مسلمان تمدن بلکہ ہندوستانی تمدن۔ میری عرض ہے کہ اس فلسفہ کو اور آگے بڑھائیے۔ اور کہئے کہ نہ ہندو بولی۔ نہ مسلمان بولی۔ بلکہ ہندوستانی بولی۔ لیکن کیا وفاداری کے ساتھ ہم سب اس کے ساتھ ہیں؟

یوپی کے سابق وزیر تعلیم نے چند مہینے ہوئے بنارس میں ہندی کے ایک جلسہ میں فرمایا ہے کہ "اردو ہندی جھگڑے کا فیصلہ قدرت نے خود کر دیا۔ یعنی یہ کہ اب نوے فی صدی لڑکے ہندی کا سٹنڈ رہے ہیں" جہاں تک کاغذ اور امتحان کے پرچوں کا تعلق ہے۔ ہمارے

وزیر صاحب کا سرکاری بیان بالکل صحیح ہے۔ لیکن جہاں تک واقفیت کا تعلق ہے یہ بیان ابھی صداقت سے بہت دور ہے۔ گو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہمارے ہموطنوں میں جھوٹی قومیت پرستی کا یہی جذبہ رہا ہے تو یہ بیان آگے چل کر واقعی صداقت نہ بن جائے گا۔

صوبہ بہار کی ہندوستانی

صوبہ بہار میں جو ہندوستانی کمیٹی دو سال سے بنی ہے اُس میں اسی کی کوشش کی جا رہی ہے کہ اونچی اردو اور گاڑھی ہندی سے اتر کر بیچ کی ہندوستانی کو ادب اور تعلیم کی زبان بنا کر پھیلایا جائے۔ اُن ہندی لفظوں کو جو اردو میں بولے جاتے ہیں قبول کیا جائے اور ایسے ہی ان عربی و فارسی لفظوں کو جو ہندی میں آ گئے ہیں اور جن کی تعداد ہزاروں سے بھی زیادہ ہے باقی رکھا جائے۔ چنانچہ اسی اصول پر ڈاکٹر تاراچند اور مولوی عبدالحق صاحب ہندوستانی لغت اور ہندوستانی اصطلاحوں کا کام کر رہے ہیں۔ اور ہم لوگ ہندوستانی ریڈیوں کی زبان درست کرنے کا کام اپنے ذمے لے رہے ہیں لیکن ہم کو معلوم ہے کہ اس تحریک کے دبانے کے لئے بھی کیا کچھ نہیں کیا جا رہا ہے اور اس کی کھلی مثال پروفیسر سکسینہ کی مذکورہ بالا تحریر میں ہے جس کو انھوں نے بہار کی ہندوستانی کمیٹی سے استعفا دیتے ہوئے لکھا ہے۔

یوپی کا رویہ

یوپی کی سابق حکومت کے صیغۂ تعلیم کا غالباً یہ منشا تھا کہ اردو اور ہندی کو ابھی ایک ساتھ چلنے دیا جائے لیکن قومی کوششوں کے علاوہ سرکاری امدادی ذریعوں سے بھی ایسی کوشش کی جائے کہ سنسکرتی ہندی کا پلہ دن پر دن بھاری ہوتا چلا جائے یہاں تک کہ اردو کس مپرسی سے اپنی موت آپ مر جائے۔ اور سنسکرتی ہندی ہر جگہ چھا جائے۔ پھر اُس وقت کا وزیر تعلیم بے جھجک یہ کہہ سکے گا کہ اردو ہندی کا فیصلہ خود بخود ہو گیا۔ کیونکہ اب سو فی صدی لڑکے ہندی پڑھ رہے ہیں۔

پہلے تو کچھ میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے اسکولوں میں لڑکوں کو ہندی پڑھانے پر زور دیا جاتا تھا۔ اور اردو کے اُستاد نہ ہونے یا نہ رکھنے کے سبب سے دیہاتی لڑکوں کو ہندی سیکھنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ یا وہ مجبور ہوتے تھے۔ اب آج کل کی روشنی میں یہ اندھیر ہو رہا ہے کہ ہندی کی کوششوں میں اوپر سے نیچے تک سرکاری عہدہ دار اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ جگہ جگہ دورے کرتے ہیں۔ جلسوں میں اپنے جج کی حیثیت سے جاتے ہیں اور ہندی کی ترقی کے لئے پورا زور دکھاتے ہیں۔ حالانکہ ان کو یا تو دونوں کے ساتھ ایک طرح کا برتاؤ کرنا۔ یا دونوں سے ناطرفدار ہو جانا چاہیے تھا۔ میرے خیال میں یہ کانگریس کے ساتھ ہمدردی نہیں۔ بلکہ کھلی دشمنی ہے۔

اور مسلمانوں کے ذہن میں یہ غلطی بٹھائی ہے کہ جب ہم آدھے اختیار پا کر یہ کر رہے ہیں تو پورا اختیار پا کر کیا کچھ نہ کریں گے، ملک کی پالیٹکس پر اس غلطی کا جو بڑا اثر اب پڑ رہا ہے، اور جو آگے پڑے گا وہ چھپا نہیں۔ میں نے اس وقت صفائی سے جو کچھ کہا ہے امید ہے کہ ہمارے دوست اس کو نیک نیتی سے سُنیں گے اور کہنے والے کی بھی نیک نیتی سمجھیں گے،

<u>زبان کی پہچان</u> زبان کے مسئلہ میں ہماری پالیسی کھلی ہوئی یہ ہونی چاہئیے کہ زبان وہ ہے جو بازاروں میں بولی، اور عدالتوں اور اسٹیشنوں میں سمجھی جاتی ہے۔ اور جو ہندو مسلمان دونوں کے بیچ میں سمجھنے اور سمجھانے کے کام میں آتی ہے۔ وہ نہیں جو شبد ساگر دل اور قاموسوں میں لکھی ہوئی ہے۔ ہماری بولی وہ ہے جس کے لفظ بازار کے چلتے ہوئے سکے ہیں۔ نہ وہ جس کے لفظ کونوں اور گوشوں میں پڑے ہوئے زنگ کھائے ہوئے غزنوی اور بکرماجیت کے زمانوں کے وہ سکے ہیں جن سے پرانی یادگاروں کے ماہر اور پرانی تاریخ کے شائق تو فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ مگر اُن سے بازار کے چلن کا کام نہیں لیا جا سکتا۔

<u>مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری</u> مسلمان اس مسئلہ میں بھی وہی کوتاہی کر رہے ہیں، جو اُن کے ہر قومی کام میں ہے۔ یعنی یہ زبان اور قلم کے شیر بنے ہوئے صرف بول رہے اور لکھ رہے ہیں۔ کچھ کر نہیں رہے ہیں۔ ان کو یہ یقین کرنا چاہیے کہ زبان اور قلم کے یہ بند اس سیلاب کے دھارے کو نہیں روک سکتے جو پورے زور سے بہہ رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم ہاتھ پاؤں ہلائیں۔ اپنی گاڑھی کمائی کے کچھ ٹکڑے مانگنے والوں کی جھولی میں ڈالیں۔ اُن پڑھوں کو پڑھانے کی جو تحریک دو برسوں سے چل رہی ہے۔ ہمارے نوجوان اس کے لئے ابھی تک کچھ نہیں کر سکے ہیں۔ کچھ برسوں کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ اردو اور ہندی پڑھے لکھوں میں تعداد کا کتنا بڑا فرق ہو گیا۔ اور اس فرق کی وجہ سے اگر کوئی نتیجہ ہماری توقع کے خلاف نکلا تو اس کی ذمہ داری ہمارے ہی سر ہو گی۔

<u>ہم کو کیا کرنا چاہئیے</u> پورے ملک میں انجمن ترقی اردو کے علاوہ اردو کی دیکھ بھال اور ترقی کے لئے کوئی دوسری انجمن نہیں ہے۔ اور اس کی شاخیں بھی صرف بڑے بڑے صوبوں تک ہیں۔ شہر شہر اس کی شاخیں اور ان شاخوں میں کام کرنے والے لوگ نہیں۔ جب تک ہم پوری سرگرمی اور جوش و خروش سے کسی کام کو نہیں کریں گے۔ اُس کا ہونا معلوم

بڑی بڑی کتابوں اور تصنیفوں کو چھوڑ کر جن کے پڑھنے والے کم ہیں۔ ہم کو عوام کی خاطر

چھوٹی چھوٹی عام پسند کتابیں اور رسالے سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں چھپوا کر پھیلانا چاہیئے - بلکہ اگر ہوسکے تو ہندی خط میں صاف ستھری بولی کی کتابیں بھی لکھوائی اور چلائی جائیں اور بتایا جائے کہ ہم اِس ہندی کے خلاف نہیں جو ہندو مسلمان دونوں کی زبان ہو۔

ہندی کا درجہ کیا ہو

ملک کی زبان کے مسئلہ کو طے کرنے کے لئے صحیح راستہ یہ ہے کہ ہندوستانی اردو - یا اس کو آسان اردو کہہ لیجئے ہندو مسلمانوں کی مشترک زبان ہو اور خالص ہندی کی حیثیت وہ ہے جو مسلمانوں کی فارسی کی ہے - اور سنسکرت کا درجہ عربی کا ہے - اگر ہم سب اس تصفیہ پر ایک ہو جائیں یا ہماری سب مشکلیں دور ہو جائیں - مگر افسوس ہے کہ ملک میں ایک طبقہ ایسا ہے جو نہ صرف ہندی بلکہ سنسکرتی ہندی کو ہندوستان کی زبان بنانے پر تلا ہے - اور وہ ایک ایسی غلطی کر رہا ہے جس سے قومی تنگ دلی کے سوا کوئی دوسرا فائدہ نہیں پہنچ سکتا اور جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک دو حصوں میں بٹ جائے۔

اردو اب بھی ہندوؤں کی زبان ہے

ابھی تک گو کہ چالیس برس سے یہ طبقہ یہ سمجھانے کی پوری کوشش کر رہا ہے کہ اردو مسلمانوں کی اور ہندی ہندوؤں کی زبان ہے - پھر بھی واقعہ یہ ہے کہ اردو ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان باقی ہے - ہندو اخبار اور رسالے اس زبان میں نکل رہے ہیں - ہندو مصنف اس زبان میں کتابیں لکھ رہے ہیں - ابھی ستمبر کے آخیر میں یوپی سرکار کے صیغۂ توسیع تعلیم میں دیہاتی لائبریریوں کے لئے کتابیں مانگی گئی تھیں - اس سلسلہ میں اٹھارہ سو اردو کتابیں اور ۱۰۷ اردو کے مسودے اس صیغہ کو موصول ہوئے - ان چھپی ہوئی کتابوں میں آدھی سے کچھ کم کتابیں ہندو مصنفوں کی تھیں - اور مسودوں میں ۱۰۷ میں سے ۲۳ مسودے ہندو مصنفوں نے بھیجے تھے - ہم اس واقعہ سے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ سمجھدار ہندو طبقہ جس نے تنگ خیالی سے اپنے کو اونچا کر رکھا ہے ابھی تک ہمارے بزرگوں کے اس فیصلہ کو کہ یہ زبان دونوں قوموں کی مشترک میراث ہے مان رہا ہے - اور اس پر پختگی کے ساتھ یقین رکھتا ہے۔

مسلمان مورخین زبان کی ایک غلطی

بعض مسلمان مصنفوں نے جنھوں نے اردو زبان کی تاریخ لکھی ہے یہ بڑی غلطی کی ہے کہ انھوں نے اس زبان کی تاریخ لکھتے وقت مسلمانوں کی کوششوں کا ذکر تو پورا کیا ہے لیکن ہندو شعرا اور اہل زبان و اہل قلم کی کوششوں کو نظر انداز کر دیا ہے - ضرورت ہے کہ اب اس زبان کی ایک ایسی تاریخ لکھی جائے

جس میں دونوں کی محنتوں اور کوششوں کی پوری تفصیل ہو۔ آج یہ واقعہ کس کو معلوم ہے کہ لکھنؤ میں اردو شاعری کا سب سے بڑا استاد رائے سرب سنگھ دیوانہ تھا۔ جس کی تربیت کی گود میں لکھنؤ کے اچھے اچھے شاعر مرزا جعفر علی حسرت اور میر حیدر علی حیران پلے تھے۔ لالہ کانجی لال حیا بندرابن راقم۔ پنڈت دیا شنکر نسیم تفتہ۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار، چکبست، برق، سرور، شاد نوبت رائے نظر۔ ساحر دہلوی۔ دیا نرائن نگم، پریم چند، کشن پرشاد کول، پنڈت برجموہن دتاتریہ وغیرہ کی کوششوں کا پایہ کم نہیں ہے۔ یہ چند نام یوں ہی زبان پر آگئے ہیں ورنہ اگر ان کے سب ناموں اور کاموں کو جمع کیا جائے تو ایک دفتر ہو جائے۔

غرض یہ ہے کہ جس راستہ پر ہمارے بزرگ اب تک چلتے آئے ہیں۔ وہی راستہ ہمارے اتحاد اور آگے کے کام کی ضمانت ہے۔ اس کو چھوڑ کر جو دوسرا راستہ اختیار کیا جا رہا ہے وہ ہم سب کو گمراہ کر دے گا۔

سنسکرتی ہندی کے رواج کی دلیل ادھوری ہے

یہ کہنا بھی درست نہیں کہ چونکہ ہم کو بنگال، مہاراشٹر اور مدراس کے لوگوں کو ملا کر چلنا ہے جن کی صوبہ وار زبانیں سنسکرت ماخذ سے ملتی ہیں اس لئے سنسکرتی ہندی ہی ان سب کو ایک کر سکتی ہے یہ دلیل ایک آنکھ بند کر کے پیش کی جاتی ہے۔ اگر ہم دونوں آنکھیں کھول کر دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ ہم نے یہ دلیل دیتے وقت واقعی ایک آنکھ بند کر لی تھی۔ اس لئے ہم نے آدھے ہندوستان کو دیکھا اور آدھے کو نہیں دیکھا۔ کیا ہندوستان میں کشمیر، سرحد، سندھ، بلوچستان، اور پنجاب نہیں ہے کیا ان کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے ان لوگوں کی زبانوں کے اصلی ماخذوں سے کیوں آنکھیں بند کی جائیں۔ اس کے علاوہ دراوڑی زبانوں سے کیوں غفلت برتی جائے جن کو نہ اردو سے لگاؤ ہے نہ ٹھیٹھ ہندی سے۔ اس پر بھی اسلامی مدراس کے ہر حصہ میں اردو بولی اور اس سے زیادہ سمجھی جاتی ہے۔ اور ملیبار تک اس کا نشان پایا جاتا ہے۔

الہ آباد یونیورسٹی کے لائق پروفیسر جھا نے اپنی ستمبر ۱۹۳۹ء کی گوالیار والی تقریر میں فرمایا ہے۔

"اردو ڈیڑھ سو برس سے اُتر ہندوستان کے اُن شہروں کی زبان ہے جو اسلامی تہذیب کے مرکز تھے۔ اور مسلمانی درباروں کی اور ان کی جو اُن درباروں سے لگاؤ رکھتے تھے مشترک زبان تھی۔ اور جس کی شاعری کا وزن و محاورہ اور تشبیہیں کوئی چیز

ہندوستانی نہیں"۔

اس زبان میں اسلامی اور ہندی دونوں تمدنوں کا نشان ہے

اردو کا لفظ گوکہ بہت پیچھے کا ہے۔ اسی لیئے میں اس نام کو صحیح نہیں سمجھتا۔ لیکن اس سے مقصود تو وہ زبان ہے جو مسلمانوں کے یہاں آنے سے پہلے سندھ یا پنجاب یا ہریانہ اور دہلی کے آس پاس بولی جاتی تھی۔ اور جس میں مسلمانوں کے آنے سے کچھ ان کی ضرورت کے عربی فارسی یا ترکی لفظ ایسے گھل مل گئے کہ اب وہ اپنے اصلی معنوں میں بہت کم رہ گئے۔ کیا اس زبان کی تاریخ ڈیڑھ سو برس کی ہے۔ اور کیا وہ مسلمانی دربار وں میں بنی ہے اور کیا اس کے خیالات۔ محاوروں اور مثلوں میں کوئی چیز ہندوستانی نہیں۔ ہندوستانی ایکاڈیمی کے کسی پچھلے نمبر میں شاہ معین الدین ندوی کا وہ مفصل مضمون چھپ چکا ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ اس زبان میں ہندی تمدن اور تہذیب کا کتنا بڑا حصہ ہے۔

اردو میں جو تاریخی اور فرضی نام اس کے ادب کا جز ہیں اس میں اسلامی اور غیر اسلامی سب ہی قسم کے نام ہیں۔ رستم، سہراب، حاتم، سکندر، دارا، افلاطون، ارسطو، جمشید، فرعون، نمرود، ان میں کوئی بھی مسلمان نہیں، یہ اسلام سے پہلے کے عربی یا اسلام سے پہلے کے ایرانی مصری اور یونانی نام ہیں۔ یہ نام پچھلی دنیا میں وہی حیثیت رکھتے تھے جو آج نپولین، قیصر، سالسبری، بسمارک، جارج واشنگٹن، ہٹلر، مسولینی وغیرہ کے ہیں۔ جن کا تعلق قوموں سے نہیں بلکہ دنیا سے ہے۔ انھیں میں وہ نام بھی ہیں جن کو ہمارے ہندوستان نے پیدا کیا ہے جیسے بھیم، ارجن، کرشن، رام، سیتا، گوتم بدھ، بھگت وغیرہ۔ یا جو الہ طلب قصے ہیں۔ جیسے مہابھارت، رامائن، بھرت ملاپ، گوپیاں یا تہوار ہیں جیسے ہولی، بسنت وغیرہ، یہ سب ہماری زبان کی مثلوں اور مثالوں میں وقت پر آتے ہیں اور زبان میں بڑا مزہ دیتے ہیں۔ جو قوم رستم اور سہراب اور سکندر اور دارا کے ناموں اور کاموں سے خوش ہو وہ بکرماجیت اور رام چندر کے ناموں اور کاموں سے کیوں خوش نہ ہوگی۔ جو مذہبی حیثیت ان کی ہے وہی ان کی ہے۔ پھر ایک سے محبت اور دوسرے سے نفرت کی کوئی وجہ نہیں۔

پرانی ہندی اور مسلمان

ہندوستان کی وہ میٹھی اور پیاری بولی جس کا نام اصل میں ہندی ہے وہ ہمارے بزرگوں میں پہلے بھی مقبول تھی اور اب بھی ہے۔ بڑے بڑے

صوفی بزرگوں کی محفلوں میں حضرت سید حسین گیسو دراز اور سعد اللہ فراز لکھنوی کے زمانہ سے وہ گائی جاتی تھی۔ اور اب بھی ہماری خانقاہوں میں گائی جاتی ہے۔ اور اس میں کبت اور گیت کہے، اور سُنے جاتے تھے۔ اور ایسے مسلمان جو پریم اور محبت کی اس پیاری بولی میں شاعری کرتے تھے سینکڑوں سے زیادہ ہیں۔ لیکن جو ہندی آج پھیلائی جا رہی ہے فورٹ ولیم کالج سے پہلے وہ موجود نہ تھی۔ اس کا پتلا انگریزوں کی سیاسی جادوگری سے بنا ہے اور اسی سے اس میں جان پڑی ہے۔ اور اسی جادو کا کھیل ہے جو آج ہندی اردو جھگڑے کی شکل میں دونوں قوموں کو اب تک لڑا رہا ہے۔ یہ حقیقت ہے اور اس حقیقت کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔

صوبوں کی بولیوں کو مسلمانوں نے زبان بنایا ہے

اگر کسی زبان کا کسی اسلامی زبان سے لگاؤ رکھنا کوئی پاپ ہے جو معاف نہیں ہو سکتا۔ تو میں کہتا ہوں کہ آج صوبہ کی اکثر بولیاں جو زبان کے درجہ کو پہونچی ہیں ان میں سے اکثر اسلامی درباروں کی سرپرستی میں پھلی اور پھولی ہیں جیسے بنگالی، گجراتی، مرہٹی وغیرہ۔ کیونکہ یہ چھوٹی چھوٹی زبانیں مسلمانوں سے پہلے پڑھنے لکھنے کے کام میں نہیں آتی تھیں۔ اور یہ مسلمانوں ہی کی سرپرستی میں زبان اور ادب بنی ہیں تو پھر کیا یہ زبانیں اس لئے آج بھارت ورش سے نکال دی جائیں گی کہ ان کو اسلامی درباروں سے لگاؤ رکھنے والوں نے پھیلایا ہے اور انھیں درباروں کے سایہ میں وہ پھلی پھولی ہیں۔ ان ساری زبانوں میں بڑی بہتات سے عربی اور فارسی کے ضروری لفظ بھی ملے ہیں۔ لیکن اس پر بھی وہ ناپاک نہیں ہوئیں۔

دیہات کی زبان ہندی نہیں

یہ کہنا بھی سچ نہیں کہ ہندی دیہاتوں کی زبان ہے اور اردو شہر کی، دیہات اور شہر دونوں کی بولی ایک ہی ہے۔ فرق ان میں وہی ہے جو دیہات اور شہر کی زندگی میں ہے۔ جو ہندی آج ہندی اخباروں اور رسالوں میں لکھی جاتی ہے وہ دیہات تو دیہات شہروں میں بھی نہ بولی جاتی ہے اور نہ سمجھی جاتی ہے اور اس کا تجربہ ہر روز اور ہر وقت کیا جا سکتا ہے۔ اور اسی وقت اس دعوے کی سچائی کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔

ہندو مسلمانوں سے اپیل

میں پھر ہندو مسلمان دونوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ تنگ دلی اور چھوٹی قومیت کی غلط پاسداری کر کے اپنے ملک کو تباہ نہ کریں

اور اس کشتی میں وہ سوراخ نہ کریں جس سے وہ پھر کبھی نہ بن سکے گی۔ اور جس کا نتیجہ سب کے لئے ایک ہے۔ میں اپنے اس بیان کو سر تیج بہادر کے اُس مخلصانہ اور بہادرانہ بیان پر ختم کرتا ہوں جو انھوں نے ۲۶۔ اگست ۱۹۳۹ء کو کشمیر میں ایک مشاعرہ کی صدارت کرتے ہوئے فرمایا۔

سر سپرو کا بہادرانہ بیان

"آج کل ہندوستان میں زبان کے سوال پر بڑی قیل و قال ہو رہی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر ہندوستان میں کوئی زبان ایسی ہے جو پشاور سے سی پی تک اور سی پی سے آگے صوبہ بمبئی کے بعض مقامات تک بولی اور سمجھی جاتی ہے تو وہ اُردو اور صرف اردو ہے۔ وہ لوگ صریح غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔ جو یہ کہتے ہیں کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے میں اس دعوے کو تسلیم کرنے سے صاف طور پر انکار کرتا ہوں۔ اگر مسلمان یہ کہتے ہیں کہ اُردو ان کی زبان ہے تو میں اس قول کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔ اس لئے کہ اُردو ایک ایسی زبان ہے جس کو بنانے میں ہندو اور مسلمان دونوں نے برابر کی خدمات انجام دی ہیں۔ اس لئے اس کی کوئی وجہ نہیں کہ ہندو اردو کو اپنی زبان نہ سمجھیں اور اس سے نفرت کریں یا مسلمان اُسے صرف اپنی زبان سمجھیں۔

چند دنوں سے "ہندوستانی" کی ایک نرالی اصطلاح وضع ہوئی ہے۔ اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس اصطلاح سے زبان کی موجودہ نزاع ختم ہو جائے گی۔ لیکن یہ خیال سراسر غلط ہے۔ اس کے برعکس اس اصطلاح نے زبان کے قضیہ کو حل کرنے میں اور زیادہ پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی کوئی ایک زبان ہی نہیں۔ ہندوستان میں جتنی زبانیں بولی جاتی ہیں اُن سب کو ہندوستانی کہا جا سکتا ہے۔ تامل یا تلیگو بھی اسی طرح ہندوستانی زبان ہے جس طرح کسی اور صوبہ کی زبان ہو سکتی ہے۔ ہاں اگر ہندوستانی کے لفظ سے وہ زبان مراد لی جاتی ہے جو دہلی میں آج سے پچاس سال پہلے بولی جاتی تھی یا جو زبان آج لکھنؤ میں رائج ہے۔ تب البتہ میں اس اصطلاح کو ماننے کے لئے تیار ہو سکتا ہوں۔

اردو ایک ایسی زبان ہے جس میں عربی، فارسی اور سنسکرت کے بہت سے الفاظ شامل ہیں۔ اسی لئے ان زبانوں کے جو الفاظ اردو میں رائج ہو گئے ہیں۔ اُن کو اردو سے خارج

کرنا صحیح نہیں ہو سکتا۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم عربی، فارسی اور سنسکرت کے رائج الوقت الفاظ سے اپنی زبان کو محروم کریں۔ درانحالیکہ وہ ہماری زبان کا جزبن گئے ہیں۔ اگر کوئی لفظ عربی فارسی یا سنسکرت زبان سے لیا گیا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ محض اس بنا پر اسے اردو سے خارج کر دیا جائے۔ البتہ یہ بات بھی غیر ضروری ہے کہ ہم اردو میں عربی، فارسی کے مزید الفاظ شامل کریں۔ اور اس طرح اسے مشکل بنا دیں۔

یہ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ اردو ایک ایسا مقدس ترکہ ہے جو ہندوستان کو اپنے بزرگوں سے وراثت میں ملا ہے۔ اگر مسلمان یہ کہتے ہیں کہ اردو صرف ان کی زبان ہے۔ تو ہندوؤں کو یہ دعویٰ ہرگز نہ ماننا چاہئے۔ میں ہندو ہوں۔ لیکن ہندو ہونے کے باوجود اس حقیقت کا اعلان کرنے میں مطلق کوئی تذبذب محسوس نہیں کرتا کہ ہماری زبان اردو ہے۔

ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ اردو ہی ایک ایسا رابطہ ہے جو ہندو مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کر سکتا ہے۔ اگر ہم نے اس رابطہ کو توڑ دیا تو ہم ایک بہت بڑے قومی جرم کا ارتکاب کریں گے۔

بنگال میں اردو

آخر میں مجھے اس صوبہ کے اہل فکر کی خدمت میں کچھ عرض کرنا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بنگال میں بنگالی کی اہمیت صوبہ کی مقامی بولی کی حیثیت سے زیادہ ہے پھر بھی یہ بھولنا نہ چاہئے کہ اردو کی پرورش میں اور ملک کو ایک مشترکہ زبان کے بخشنے میں بنگال کا حصہ کم نہیں ہے۔ مرشد آباد اور ڈھاکہ اردو ادب کی آخری سرحدیں تھیں اور جہاں اردو کے بڑے بڑے شاعروں نے جنم لیا ہے۔ اور شہرت کے بال و پر پیدا کئے ہیں۔ اور شعرائے لکھنؤ کے مقابلہ میں میدان مارے ہیں۔ اور ان کے دیوانوں پر نسخ کا قلم پھیرا ہے۔ عبد الغفور نساخ اور نواب سید محمد آزاد کے نام اردو ادب میں یادگار ہیں۔ اور آج بھی وحشت کی شاعری سے لکھنؤ اور دہلی کی ادبی محفلیں مانوس ہیں۔ موجودہ اردو ادب کا مافوق انشا پرداز جس کے قلم میں سحر حلال ہے اسی احاطہ میں سکونت پذیر ہو کر۔

فورٹ ولیم کالج جس نے اردو کے الجھے ہوئے بالوں میں کنگھی کی۔ اسی سرزمین کے ایک گوشہ میں تھا۔ میر امن کا باغ یہیں پر بہار ہوا۔ اور حاتم طائی کی محفل نے یہیں آرائش پائی۔ اور اخوان الصفا نے انسانوں کو حیوانوں کا فلسفہ یہیں پڑھایا۔ پھر کتنی عجیب بات ہے کہ جب انگریزوں کی تعلیمی رائے بدلی تو اس سرزمین کو اپنے اس بچہ سے جس کو اس نے گود میں لیا

پالا تھا ایسی بیگانگی ہو گئی کہ اب بنگال اور اردو دو متضاد چیزیں ہیں۔
بنگال کو اس زبان سے اتنی بیگانگی کسی طرح نہیں جتنی مدراس کو ہندی یا ہندوستانی سے ہے۔ مگر یہ کس کو معلوم نہیں کہ مدراس کی سابق گورنمنٹ نے جب وہاں ہندی یا ہندوستانی کی اشاعت کی ضرورت سمجھی تو دراویڈی قوموں کی ہر قسم کی مخالفت کے باوجود اس کی تعلیم کو ضروری قرار دے دیا اور احاطہ مدراس میں اس کی اشاعت پر ہزاروں روپیہ خرچ کرے، اگر اسی نظیر کو بنگال میں سامنے رکھا جاتا تو ملک کی ایک بڑی ضرورت پوری ہوتی۔ اور ہندوستانی صوبوں کی برادری میں بنگال کی اس کوشش کی بڑی تعریف کی جاتی ہے۔
کہا جاتا ہے کہ بنگال میں مسلمانوں کا سب سے بڑا حصہ آباد ہے اگر یہ سچ ہے تو بنگال کے کندھوں پر بھی اسلامی ضرورتوں کا سب سے بڑا بوجھ ہے۔ ہندوستان کی ساری اسلامی برادری نے اُردو کو اپنی مشترک زبان مانا ہے۔ اور اس کو پھیلانے اور بڑھانے میں صدیاں گنوائی ہیں۔ بڑا افسوس ہوگا اگر ہندوستان کا سب سے بڑا اسلامی صوبہ اس زبان سے اپنی بے التفاتی کا ثبوت دے۔
آج سارے ہندوستان میں جو اسلامی تحریکیں پھیلی ہیں، اور اسلامی ہندوستان نے جو بڑے بڑے نامور مصنف اور اہل قلم پیدا کئے ہیں۔ بنگال کا بڑا حصہ اس لئے اُن سے ناآشنا ہے کہ وہ اُس زبان سے جس میں وہ خیالات امانت ہیں بیگانہ ہے، اور اس طرح ہندوستان کا سب سے بڑا اسلامی صوبہ اسلامی تحریکات اور خیالات سے سراسر غیر متاثر ہے اور اس سے جو نقصان اسلام کو اس ملک میں پہنچ رہا ہے وہ بیان کا محتاج نہیں۔
ہم کو معلوم ہے کہ بنگال کے اندرونی حصوں تک میں ہزاروں مسلمان اس زبان کو بولتے اور سمجھتے ہیں۔ لیکن اردو قواعد کی بعض مشکلوں اور تذکیر و تانیث کے جھگڑوں کے سبب سے اُن کو الجھن ہوتی ہے۔ لیکن اگر اہل بنگال جرأت کرتے تو اپنی ضرورت کے مطابق وہ لاہور اور پٹنہ کی طرح اپنی اردو آپ بنا لیتے اور دلّی اور لکھنؤ والوں کو اُس کے ماننے پر مجبور کر دیتے۔
وقت ابھی نہیں گیا ہے اور آج سے زیادہ اس کے لئے کوئی دوسرا مناسب وقت مشکل سے مل سکتا ہے،

"اے زفرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش"

بنگال کی سرکار کو چاہیے کہ ہندوستانی اردو کو اس صوبہ کے اسکولوں کی تعلیم میں مناسب حصہ دے۔ اور شہروں میں اس زبان کی لائبریریاں قائم کرے۔ اور سرکاری حیثیت سے ہٹ کر خود بنگال والوں کی ایک طاقتور جمیعت تبلیغ کے طور پر یہ کام اپنے ہاتھ میں لے۔ اس کے ممبر شہروں سے گاؤں تک پھیل جائیں۔ اردو ہندوستانی پرچارک سبھائیں بنائیں۔ اور لوگوں کو یہ زبان سکھائیں۔ اگر اردو رسم خط کی مشکل ہو تو شروع میں اس رسم خط کو بھی چھوڑ دیں اور بنگالی یا لاطینی خط میں اس زبان کے چھوٹے چھوٹے رسالے لکھیں اور پھیلائیں۔ بنگالی ہندوستانی اردو ڈکشنری لکھیں۔ ادبی، اخلاقی اور مذہبی قصے لکھ لکھ کر لوگوں کے ہاتھوں میں دیں۔ آپ دیکھیں گے کہ چند سال کے اندر بنگال ہندوستان کا جز ہو جائے گا۔ اور بنگال کی یہ قربانی ایک طاقتور ہندوستان کے بنانے میں بڑی مدد دے گی۔ آج پنجابی بولنے والے پنجاب کا اردو و ہندوستانی پریس سارے ہندوستان پر راج کر رہا ہے۔ پھر کیوں بنگالی بولنے والے بنگال میں ایسا ہندوستانی پریس نہ ہو جو ان مقبوضات کو اسی طرح اپنے قبضہ میں نہ لے آئے۔ ہمت شرط ہے اور ایثار و قربانی کی تھوڑی ضرورت۔ آج ہندوستان کے مسئلہ کی کنجی مدراس کے ہاتھ میں نہیں۔ بنگال کے ہاتھ میں ہے کیا اہل بنگال اس مشکل کے قفل کو کھولنے کو تیار ہیں؟

جناب صدر کے مندرجہ بالا خطبہ کے بعد پروفیسر محمد محفوظ الحق صاحب ایم اے نے ایک پُر از معلومات مقالہ پڑھا جو بڑی دلچسپی سے سنا گیا، یہ مقالہ جو ایشیاٹک سوسائٹی کی اردو مخطوطات سے تعلق رکھتا ہے حسب ذیل ہے۔

کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی میں اردو مخطوطات کا ذخیرہ

کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی آج سے ایک سو چھپن برس پہلے ۱۷۸۴ء میں قائم ہوئی، اس میں عربی، فارسی، سنسکرت، پالی وغیرہ زبانوں کی قلمی کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے، فارسی و عربی کی قلمی کتابیں پانچ ہزار کے قریب ہیں لیکن اردو کی قلمی کتابیں صرف سوا سو اور ڈیڑھ کے درمیان ہیں سوسائٹی عربی و فارسی کی قلمی کتابیں خریدتی ہے لیکن اردو کی کتابیں نہیں خریدتی، اردو کا ذخیرہ صرف ان کتابوں کا ہے جو کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج کے بند ہونے کے بعد یہاں آیا ان کے علاوہ تھوڑی سی کتابیں سلطان شہید ٹیپو سلطان کے کتب خانہ سے آئیں اس کے علاوہ دو چار کتابیں تحفہ کے

طور پر بھی ملی ہیں، بس یہی ذخیرہ ہمارے یہاں ہے، گو کتابوں کی تعداد بہت کم ہے لیکن بعض ان میں ایسی ہیں جن کا صرف ایک ہی نسخہ دنیا میں ہے جو اس سوسائٹی میں محفوظ ہے، اس کے علاوہ بعض کتابیں ایسی بھی ہیں جن کا صرف ایک ہی نسخہ ہندوستان میں ہے اور اس کے دوسرے نسخے یا تو برٹش میوزیم (لندن) یا انڈیا آفس لائبریری (لندن) وغیرہ میں ہیں، اس لئے ہندوستان میں اگر ان کتابوں کو دیکھنا ہو تو ایشیاٹک سوسائٹی میں آنا پڑے گا۔

پہلے میں اُن کتابوں کو بیان کروں گا جو **فورٹ ولیم کالج** سے ہمارے یہاں آئیں اس میں زیادہ تر وہ کتابیں ہیں جو خود فورٹ ولیم کالج کے مصنفوں نے لکھیں، ان مصنفوں کی اُن کتابوں کا ذکر جو چھپ گئی ہیں یا جن کے نسخے عام طور پر ملتے ہیں بیکار ہے اس لئے میں صرف اُن قلمی کتابوں کا ذکر کروں گا جن کے نسخے نہیں ملتے یا کمیاب ہیں،

مثلاً حیدر بخش حیدری کی ایک مثنوی **ہفت پیکر** نامی ہے جو نظامی کی مشہور مثنوی کے انداز پر لکھی گئی ہے، مولف "ارباب شرار دو" کا بیان ہے کہ "اس مثنوی کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ شاہان اودھ میں تھا، ہم کو اس کا کوئی نسخہ نہیں ملا" وہ مثنوی یہاں موجود ہے حیدری کی ایک اور کتاب "تاریخ نادری" ہے جو تاریخ جہاں کشائے نادری کا ترجمہ ہے بقول مولف ارباب یہ "کتاب حیدری کا نہایت قابل قدر کارنامہ ہے" اردو کی زبان کا دامن اتنی مدت گزرنے کے بعد بھی ایسی علمی اور اہم کتابوں سے بہت کچھ خالی ہے" اس کتاب کا بھی قلمی نسخہ سوسائٹی میں موجود ہے، اس مصنف کی ایک تیسری کتاب **گلزار دانش** جو بہار دانش کا اردو ترجمہ ہے۔ مولف ارباب نثر کا بیان ہے "ہم کو اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوا۔ اس کتاب کا بھی ایک قلمی نسخہ سوسائٹی میں موجود ہے۔ حیدری کی ایک تالیف تذکرہ گلشن ہند ہے جو اردو شعراء کے تذکرہ مرزا الطف کے "تذکرہ گلشن ہند سے مختلف ہے۔ ۱۲۰۱ھ تک صرف ایک نسخہ کا پتہ چلا تھا جو آکسفورڈ یونیورسٹی کے انڈین انسٹی ٹیوٹ میں ہے، دوسرا نسخہ ہماری سوسائٹی میں ہے۔

میر شیر علی افسوس فورٹ ولیم کالج کے مشہور مصنفوں میں تھے۔ ان کے دیوان کا ایک مکمل نسخہ بھی یہاں موجود ہے۔

میر بہادر علی حسینی نے ایک تاریخ آسام لکھی تھی مولف ارباب کا بیان ہے "بہادر علی

کا یہ ترجمہ بالکل نایاب ہے، یورپ کے کتب خانوں میں بھی اس کا کوئی قلمی مسودہ نہیں ہے"
لیکن شکر ہے کہ اس کا ایک قلمی نسخہ سوسائٹی میں موجود ہے،

مظہر علی ولا کی تالیفات میں ایک کتاب ہفت گلشن ہے جو ناصر علی خاں واسطی بلگرامی کی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے، مؤلف ارباب کا بیان ہے کہ اس وقت تک صرف ایک قلمی نسخہ کا پتہ چلا ہے اور وہ برٹش میوزیم میں ہے دوسرا نسخہ ہماری سوسائٹی میں ہے،

مظہر علی خاں ولا کی ایک اور تالیف ہے جو عباس خاں شروانی کی تاریخ شیر شاہی کا اردو ترجمہ ہے اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس لندن میں ہے، دوسرا نسخہ ہمارے یہاں ہے ولا کی ایک اور تالیف جہانگیر نامہ کا اردو ترجمہ ہے جس میں جہانگیر کی تخت نشینی سے چھٹے سال تک کے حالات ہیں، مؤلف ارباب نثر اردو کو اس کے کسی نسخہ کا بھی پتہ نہیں چلا، ہماری سوسائٹی میں اس کا نسخہ موجود ہے، خلیل علی خاں اشک نے اکبر نامہ کا اردو ترجمہ کیا تھا، صاحب ارباب نثر اردو نے فرمایا ہے کہ یورپ کے بڑے بڑے کتب خانوں میں بھی اس کا قلمی نسخہ یا مسودہ نہیں ہے، ہم نہیں کہہ سکتے کہ اشک کا یہ ترجمہ دستبرد زماں سے محفوظ ہے یا نہیں" شکر ہے کہ وہ ترجمہ محفوظ ہے، اور سوسائٹی میں موجود ہے، اس کے علاوہ اشک کی ایک اور کتاب جس کا نام انتخاب سلطانیہ ہے اور جو انھوں نے ۱۲۱۹ھ میں لکھی، اور منتخب الفوائد ایک اور گمنام تالیف جن کا ذکر مؤلف ارباب نے کیا سوسائٹی میں موجود ہے، منشی بینی نراین جہاں بھی فورٹ ولیم کالج کے منشیوں میں تھے ۔ انھوں نے شعرا کا تذکرہ لکھا تھا جس میں حالات کم اور اشعار کا انتخاب زیادہ تھا، اور اس کا نام "دیوان جہاں" رکھا تھا، مؤلف ارباب کا بیان ہے یہ تذکرہ بالکل نایاب چیز ہے، برٹش میوزیم میں اس کا ایک قلمی نسخہ ہے، اور غالباً یہی نسخہ محفوظ ہے" لیکن ہماری سوسائٹی میں بھی اس کا ایک قلمی نسخہ ہے، جو خود مؤلف کے زمانہ کا لکھا ہوا ہے فورٹ ولیم کالج مصنفین میں سید حمید الدین بہاری ایک بزرگ تھے، انھوں نے مسٹر جان گلکرسٹ کی فرمائش پر ایک فارسی "خوان الوان" کا ترجمہ کیا اور نام اس کا "خوان نعمت" رکھا، اس کتاب کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں ہے اور دوسرا ہماری سوسائٹی میں ہے ۔ برٹش میوزیم کے فہرست نگار اور مؤلف ارباب دونوں نے کتاب کا نام خوان الوان لکھا ہے حالانکہ یہ نام فارسی اصل کا ہے ترجمہ کا نام "خوان نعمت" ہے،

فورٹ ولیم کالج کے مصنفوں کی لکھی ہوئی بعض نایاب یا کمیاب کتابوں کا ذکر تمام کرتا ہوں ۔

اردو شعراء کے تذکروں میں فتح علی گردیزی کے تذکرہ کے چار نسخے اور نواب علی ابراہیم خاں کے تذکرۂ گلزارِ ابراہیم کا ایک بہت پرانا اور مستند نسخہ ہے، انجمن ترقی اُردو نے دونوں تذکرے چھاپ دیئے ہیں۔ لیکن اگر دوبارہ چھاپنے کی نوبت آئی تو یہاں کے نسخوں سے مقابلہ بہت مفید ہوگا، میں اس سے زیادہ اور کچھ کہنا نہیں چاہتا۔

ہمارے شعراء میر، سودا، حسن، خواجہ حسن دہلوی وغیرہ کے دواوین کے بہت اچھے مستند اور پرانے نسخے ہماری سوسائٹی میں ہیں، دکن میں جو کتابیں لکھی گئیں اُن کا ذخیرہ گو مختصر ہے۔ لیکن قابل قدر ہے، مثلاً ایک پرانی دکنی مثنوی بھوگ بھل کا ایک قلمی نسخہ ہے جو بہت پرانا اور مؤلف کے زمانہ کا لکھا ہوا، خاتمہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نسخہ نواب نیکنام خان کے لئے لکھا گیا تھا، اس کتاب کا صرف ایک نسخہ کا پتہ چلا ہے جو ٹیپو سلطان کی لائبریری میں تھا۔ وہی نسخہ ہماری سوسائٹی میں ہے، اس لئے دنیا کا یہ فرد نسخہ ہے، مولوی عبدالحق صاحب اس کتاب پر ایک مضمون لکھ رہے ہیں یا لکھ چکے ہیں، اس مثنوی کے ساتھ دو چھوٹی چھوٹی مثنویاں اور ہیں جو اُسی زمانہ کی لکھی ہوئی ہیں اور قدیم دکھنی کا قابل قدر نمونہ ہیں، پرانی دکھنی مثنویوں میں ایک قابل قدر کتاب "مثنوی ماہ وپیکر" ہے جس کو احمد جنیدی نے ۱۰۶۴ھ میں لکھا۔ دنیا میں اس کے صرف دو نسخوں کا پتہ چلا ہے ایک تو سوسائٹی میں ہے اور دوسرا امپیریل لائبریری کلکتہ میں ہے، اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ امپیریل لائبریری میں اردو کی یہی ایک قلمی کتاب ہے۔ ضرورت ہے کہ یہ مثنوی بھی شائع کی جائے۔

ایشیاٹک سوسائٹی میں اور بھی قابل قدر قلمی نسخے ہیں، لیکن ان کا بیان کرنا مشکل ہے۔ کیونکہ سوسائٹی کرسمس کی وجہ سے بند ہے، نہ کتابیں ہمارے سامنے ہیں اور نہ ان کی فہرست، جو کچھ میں نے لکھا ہے۔ وہ اپنے حافظہ کی بنا پر لکھا ہے، دوسرے مولوی سید محمد کی کتاب ارباب جب ۱۹۲۷ء میں چھپ کر ہمارے پاس آئی تو میں نے اسی زمانے میں کچھ نوٹ کرلئے تھے جو اس وقت کام آئے ضرورت ہے کہ ان قلمی کتابوں کی فہرست جلد شائع کی جائے سوسائٹی نے اس طرف توجہ کی ہے اور اگر کوئی صاحب تیار ہوئے تو یہ کام ان کے سپرد کیا جائیگا۔ انشاء اللہ۔

پیرزادہ قلیم صاحب کے بعد مسٹر فضل احمد کریم آئی سی ایس نے صوبہ بنگال میں اردو

کی موجودہ حالت کے متعلق ایک مختصر تقریر کی جس میں یہ بتایا کہ بنگالی مسلمان کی زبان ہندو بنگالی کی زبان سے علیحدہ ہے جب صوبہ بنگال میں میرا تقرر ہوا تو مجھکو بنگالی زبان سیکھنی پڑی لیکن جب میں اس زبان میں گفتگو کرتا تھا تو بہت کم لوگ سمجھتے تھے آخر بعض دوستوں نے مجھے بتایا تو رفتہ رفتہ اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ جو زبان کتابوں میں ہے وہ مصنوعی ہے اور مختلف ہے اس زبان سے جو بولی جاتی ہے، اسی طرح جیسے "ہندی اتھوا ہندوستانی"

آپ نے بتایا کہ ہندوؤں کی علمی و مذہبی زبان سنسکرت ہے لیکن صوبہ کی زبان بنگالی ایک زمانہ میں بنگالیوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ بنگلہ زبان کی ترقی و ترویج کے لئے کوشش کی جائے، چنانچہ ایک شخص ودیا ساگر اور بنکم چندر چیٹرجی نے ایسی زبان لکھنی شروع کی جس میں سنسکرت کی آمیزش ہے اور جو بہت مغلق ہے، حالانکہ یہ زبان بولی نہیں جاتی گھروں میں جو زبان عام طور پر بولی جاتی ہے وہ اس مغلق زبان سے مختلف ہے بنگلہ زبان کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ لکھنے کی زبان اور، بولنے کی زبان اور، میں ایک حقیقت کا اظہار کر رہا ہوں، مثلاً بنگالی مسلمان عام طور پر لفظ "آسمان" بولتا ہے لیکن جب بڑا ہو کر لکھنے بیٹھتا تو آسمان کی جگہ "آکاش" لکھتا ہے۔

سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ مسلمان بچے کے لیے سب سے پہلے **قرآن مجید** پڑھنا ضروری ہے اس لئے ابتدا میں اس کو **قرآن مجید** پڑھایا جاتا ہے اور اس ضرورت سے سب سے پہلے جو چیز اسے سکھائی جاتی ہے وہ الف، ب، ج، د، وغیرہ ہے اس کے علاوہ بچہ کو بنگلہ رسم الخط بھی سیکھنا پڑتا ہے، جس میں وہ سب پیچیدگیاں موجود ہیں جو ہندی زبان میں ہیں یا جن کا اردو پر الزام لگایا جاتا ہے، لیکن بچہ کو بوجہ ضرورت یہ رسم الخط سیکھنا ضروری ہے،

اب یہ کہا جاتا ہے کہ بچہ کے لئے اردو پڑھنا بھی ضروری ہے، اردو پڑھنے میں بچے کے دماغ پر مزید زور پڑتا ہے، لیکن اردو رسم الخط پڑھنے کی اس کی نگاہوں کو عادت نہیں اس لئے وہ جو کچھ پڑھتا ہے اٹک اٹک کر پڑھتا ہے، مشکل اس وجہ سے ہے کہ بنگالی زبان کا رسم الخط اردو سے مختلف ہے، لہذا اگر بچہ کو یہ حق دیا جائے کہ جس زبان میں قرآن مجید پڑھتا ہو اسی میں اپنا نام لکھے تو اس طرح رفتہ رفتہ وہ ان حروف سے مانوس ہو جائے گا میرا مقصد یہ ہے کہ اگر بنگالی زبان کو اردو رسم الخط میں لکھنے کی اجازت دی جائے تو یہ مشکل بہت

کچھ حل ہوسکتی ہے لیکن لوگ ایسا کہنے سے ڈرتے ہیں، حالانکہ ایک مسلمان کو کسی سے نہیں ڈرنا چاہیئے، غرض اگر بنگالی کا رسم الخط بدل دیا جائے تو بہت کچھ آسانی ہو، یا کم سے کم یہ اجازت طلبہ کو دی جائے کہ اگر وہ اردو رسم الخط میں جواب لکھیں تو یہ جائز سمجھا جائے گا، یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے اور اگر مشکل ہو بھی تو کیا، مشکلات تو ہر کام میں ہوتی ہیں، لیکن کوشش کرنے سے کامیابی ہوتی ہے، چنانچہ ایک صاحب نے ایک پرچہ جاری کیا ہے جو بنگالی زبان لیکن اردو رسم الخط میں شائع ہوتا ہے، آپ لوگ اس پر غور کریں گے تو اس کی خوبیاں معلوم ہوں گی،

اس تقریر کے بعد بیگم صاحبہ سید احمد رشید نے پس پردہ اپنا مقالہ پڑھا جو حسب ذیل ہے،

"اردو ہندی کا اختلاف"

صاحب صدر و معزز حضرات! ہمارے ملک پر سیاسیات کا ابر چھایا ہوا ہے اور اس سے ہر شعبہ ماؤف ہے لیکن اس میں سب سے زیادہ ہماری زبان ہے اور آج سے نہیں بلکہ ایک زمانہ سے زبان پر سیاسیات نے اپنا دست سیاست پھیر رکھا ہے بلکہ یوں کہئے کہ جتنے سیاسی اختلافات اور سیاسی تنزاع پیدا ہوئے وہ سب اسی سے اور اب تک یہ سلسلہ قائم ہے، حضرات ابتدا ہی میں ہیں چند الفاظ میں یہ کہنا مناسب خیال کرتی ہوں کہ اردو ہندی دو زبانوں کا جھگڑا کب سے رونما ہوا،

اٹھارویں صدی کے آخر تک اردو کے مقابلہ میں کسی اصطلاحی "ہندی" زبان کا چرچا نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر گلگرسٹ کی فرمائش پر ۱۸۰۲ء میں للوجی لال نے پریم ساگر نامی کتاب لکھی، یہ ناگری رسم الخط میں تھی، اور اس میں اس قسم کی اردو استعمال کی گئی تھی جس سے فارسی کے عناصر فی الجملہ خارج کر دیے گئے تھے۔ یہ تھی "ہندی کی کتاب" یعنی اردو کے مقابلہ میں ایک نئی زبان جسے اصطلاح میں ہندی کہا گیا، چونکہ اس زبان کا رسم الخط اردو کے رسم الخط سے (یعنی مسلمانوں کے رسم الخط سے) مختلف تھا اور سنسکرت کے رسم الخط (یعنی ہندوؤں کی ٹوٹی زبان کے رسم الخط کے مطابق، نیز اس میں عربی و فارسی کے الفاظ کے بجائے سنسکرت کے الفاظ کے استعمال کی طرف زیادہ رجحان تھا

اس لئے ہندوؤں نے اسے اپنی زبان قرار دے لیا اور اس کی نشر و اشاعت میں دلچسپی لینے لگے۔ مسلمانوں کے نزدیک یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی اس لئے انھوں نے اس تحریک کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور حقیقتاً ابتدا میں یہ تحریک کوئی خاص اہمیت بھی نہ رکھتی تھی خود ہندو بھی بجز معدودے چند حضرات کے اس نئی زبان سے زیادہ مانوس نہ تھے۔ جب انگریزوں کے اقبال کا ستارہ چمکا تو فورٹ ولیم میں سیاست کے کھلاڑیوں نے علم و دانش کے پانسے پھینکے۔ اور اس ملک کی دو قوموں کو جو ایک ہزار سال کی محنت و جد و جہد کے بعد ایک قوم بنی تھی جس کی زبان اور جس کی سیاست ایک ہو رہی تھی اس کو پھر دو قوموں میں بانٹ کر علیحدہ علیحدہ کرنے کے لئے کوششیں شروع کیں اور ہندی اور ہندوستانی یا اردو اور زبانیں بنا کر ایک کے لئے پنڈت اور دوسری کے لئے مولوی و منشی نوکر رکھکر دو زبانوں کے لئے سامان درست کر لیا۔ ابھی اٹھارویں صدی ختم بھی ہونے نہ پائی تھی کہ فرنگی جادوگروں کے منتر سے اردو ہندی کے دو خاکی پتلے فولادی سپاہی بن کر ملک کے طول و عرض میں لڑنے و کٹنے لگے۔

اردو ۱۸۶۶ء تک ہندو مسلمانوں کی متحدہ جد و جہد سے پھولتی پھلتی رہی ان کے علاوہ اس کی ترقی میں پارسی و یورپین بھی شریک تھے۔ جنھوں نے ہندوستان میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ۱۸۵۸ء سے پہلے بھی کوئی صوبہ ایسا نہ تھا جہاں اردو اخبارات شائع نہ ہوتے ہوں، دہلی، لکھنؤ، آگرہ، جموں، بمبئی، کلکتہ، اور مدراس وغیرہ سے اچھے اچھے اخبار نکلتے تھے۔ مطابع کے اجرا و ترقی سے اردو ادب میں بھی کافی ترقی ہو گئی تھی۔ غدر کے بعد اس کی ترقی کیلئے جا بجا سوسائٹیاں قائم ہوئیں جن میں ہندو مسلمان، و ہندوستانی عیسائی سب ہی شریک تھے اور شمالی ہند میں تو خصوصیت سے وہ بنگالی جنھوں نے اس حصہ ملک میں مستقل بود و باش اختیار کر لی تھی سب سے پیش پیش تھے۔

۱۸۶۷ء میں یونیورسٹی کے انٹرنس کی زباندانی کے امتحان میں اردو شامل تھی۔ اُس سال گورنمنٹ بنگال نے زبان اردو کی ترقی کے لئے جمع سرکاری کے ساتھ جو چندہ دیہاتی مدرسوں کی ترقی کے لئے زمینداروں سے وصول کیا جاتا تھا اس میں ایک اضافہ منظور کر لیا تھا۔ علی گڑھ کی "سائینٹفک سوسائٹی" کے استحکام کے لئے ضلع کے زمینداروں نے جن میں ہندوؤں کی کافی تعداد تھی یہ تجویز کی کہ اس ضلع کے تمام دیہاتوں سے کم از کم

ایک روپیہ سالانہ ہمیشہ کے لئے واسطے قیام سوسائٹی مقرر کیا جاوے اور اس کی شرائط "واجب العرض" میں بندوبست کے وقت مندرج ہوں۔ چنانچہ یہ تجویز درخواست کی شکل میں باضابطہ پیش کی گئی۔

۱۸۶۸ء میں مہاراجہ بنارس نے چیمبر انسائیکلو پیڈیا کے اردو ترجمہ کے لئے دس ہزار روپیہ منظور کیا اور راجہ بربلبھ نراین سنگھ نے بھاگل پور میں ایک مدرسہ انگریزی و اردو کی تعلیم کے لئے جاری کرایا۔ حکومت وقت کی سرپرستی نے اس مشترکہ زبان کی رفتار ترقی کو تیز کر دیا تھا۔ نومبر ۱۸۳۷ء میں جب دفاتر سے فارسی کا اخراج ہوا تو ایک قانون گورنر جنرل کی کونسل سے تبادلہ زبان کے اختیار کا نافذ کیا گیا تھا اور ۱۸۳۹ء میں صدر عدالت دیوانی نے تمام عدالت ہائے ماتحت میں اردو کے استعمال کا سرکلر جاری کیا۔ ہندوستانی ریاستوں سے بھی بجائے فارسی کے اردو میں مراسلت اختیار کی گئی۔ تعلیم اور ترجمہ پر حکومت جو کچھ خرچ کرتی تھی۔ اور اس طرح جو حوصلہ افزائی ہوتی تھی اس سے بھی بہت زیادہ اخلاقی طور پر اردو کو فروغ دینے کا یہ طریقہ نکالا کہ اعلیٰ حکام سلطنت پبلک جلسوں میں اردو میں تقاریر کرتے تھے اور اگر انگریزی میں ہوتی تھیں تو ان کا ترجمہ اردو میں سنایا جاتا تھا۔ غرض ۱۸۶۷ء تک ہندو اور مسلمان شرفاجن کے خاندانوں میں تعلیم عامہ کا رواج تھا یکساں طور پر اردو میں ترقی دینے میں بلا اختلاف مشغول نظر آتے تھے، اور حکومت بھی حوصلہ افزائی کرتی تھی۔"

جس طرح یہ کہنا مشکل ہے کہ کپڑا کترنے میں قینچی کے کس پھل نے کتنا کام کیا اسی طرح یہ بتانا کہ اردو کی ترقی میں الگ الگ ہو کر ہندو و مسلمان کا کتنا کام ہے مشکل سے مشکل تر ہے، اب اردو اس منزل پر پہنچ گئی تھی کہ ۱۸۶۷ء میں "برٹش انڈین ایسوسی ایشن" نے حکومت سے ایک یونیورسٹی قائم کرنے کی درخواست کی، اس ایسوسی ایشن میں ہر مذہب ملت کے اشخاص شامل تھے لیکن جب کہ درخواست ابتدائی مراحل میں تھی الہ آباد کے بابو سرودھا پرشاد سنڈل کی قیادت میں علی الرغم ہندی کے متعلق کوششوں کا آغاز ہوا، بنارس سے ہندی کی ترویج پر زور دیا گیا اور ہندوؤں کو ترقی اردو کی کوششوں پر ملامت کی گئی ساتھ ہی یونیورسٹی کی مخالفت بھی شروع ہو گئی، یہ مخالفت روز بروز بڑھتی رہی اور مخالفین کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ جذبات کے ابھارنے کے لئے یہ بات پیش کی گئی کہ یہ زبان

مسلمانوں کے ظلم و جور کی یادگار ہے، اس تمام شورش کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس وقت ہندوؤں میں ایک نئی قومیت کی روح پیدا ہو گئی تھی، اور قومیت کے لئے لازم ہے کہ زبان اپنی ہو، ادھر اس کے ساتھ ہی ساتھ اسی زمانہ میں دیانند سرسوتی نے اس آگ کو اور بھی بھڑکایا انہوں نے سنسکرت کی ترویج بلکہ اسی کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی حقیقت یہ ہی ہے کہ چند یورپینوں نے بھی محض سیاسی وجوہ کی بنا پر ان کا ساتھ دیا اور اس طرح ہمارے اور ان کے دل میں خیال ہوا کہ ہم اپنی اپنی زبان الگ الگ کریں،

اس مخالفت کا پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۷۱ء میں مخالفین اُردو کو بنگال میں کامیابی ہو گئی اور ۱۸۷۲ء میں نربدا اور جبل پور ڈویژن میں فارسی حرف کی جگہ دیوناگری حروف کے اجرا کا حکم ہوا، بعض با اثر حکام بھی کسی سیاسی مصلحت سے اس مخالفت کی تائید کرنے لگے، اس کے بعد ممالک مغربی و شمالی میں منظم کوششوں کا آغاز ہوا اور خواستوں پر درخواستیں دی گئیں، اور قریب تھا کہ یہاں بھی کامیابی ہو کہ فخر قوم و ملک سرسید علیہ الرحمۃ نے مدافعت شروع کی انھوں نے ۹ ردسمبر ۷۳ء کو الہ آباد میں ایک بڑا جلسہ منعقد کیا جس میں سنٹرل کمیٹی قائم ہوئی۔ اور جا بجا لوکل کمیٹیاں بنائی گئیں، انہوں نے گشتی خطوط بھی جاری کئے جن میں ان اعتراضات کو صاف صاف بیان کیا جو دیوناگری کے اجرا کے متعلق تھے اور ان نقصانات کی تشریح کی جن کا مسلمانوں کو پہونچنے کا احتمال تھا،

اس وقت یہ سوال ملتوی ہو گیا مگر جا بجا جو سبھائیں بھاشا کی ترقی کے لئے قائم ہو چکی تھیں ان کی کوششیں برابر جاری رہیں چنانچہ اسی سلسلہ میں خود بمقام علی گڑھ سائنٹفک سوسائٹی کے بالمقابل ایک بھاشا سمردھن سبھا قائم ہوئی جس نے ۱۸۸۲ء میں رائل ایجوکیشنل کمیشن کے سامنے نہایت زور شور سے اپنے مطالبات پیش کئے، سرسید علیہ الرحمۃ نے اپنی ایک رپورٹ میں جو ۱۸۸۷ء میں علی گڑھ کی تعلیمی سروے کے متعلق لکھی ان کوششوں کے متعلق حسب ذیل ریمارک کیا ہے۔ "تیس برس کے عرصہ سے مجھے ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان خیال پیدا ہوا ہے، اور میری یہ خواہش تھی کہ دونوں مل کر دونوں کی فلاح کے کاموں میں کوشش کریں لیکن جب سے ہندو صاحبوں کو یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ اردو زبان و فارسی کو جو مسلمانوں کی حکومت اور ان کی شہنشاہی ہندوستان کی باقی ماندہ نشانی ہے مٹا دیا جاوے اس وقت

سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اب ہندو و مسلمان ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا کام نہیں کر سکتے ہیں نہایت درستی اور اپنے تجربہ اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندو مسلمانوں میں جو نفاق شروع ہوا اس کی ابتدا اسی سے ہوئی گو اس کے بعد اور بھی اسباب ہوئے اور اس کے سبب سے اس نفاق کو سوائے ان پرانے ہندو مسلمانوں کے جو بڈھے اور اگلے زمانہ کے ہیں یا دور اندیش و سمجھدار ہیں اور دل سے ہندو مسلمانوں میں اتفاق چاہتے ہیں روز بروز ترقی ہے جس کی حد مقرر کرنے کے لئے کوئی پیشین گوئی نہیں ہو سکتی' علی گڑھ ہندو مسلمانوں کے باہمی اتفاق کے لئے مشہور ہے مگر افسوس ہے کہ ایسے مقدس شہر میں یہ سبھا جو بنیاد باہمی نفاق کی ہے قائم ہے۔

پھر ۱۸۹۸ء میں سر انٹونی میکڈانل کے سامنے جنہوں نے بہار میں اردو کو ہٹانے اور ہندی کی ترویج میں زبردست حصہ لیا تھا ایک ڈیپوٹیشن کی شکل میں یہ سوال اٹھایا گیا مگر سر سید علیہ الرحمۃ کے مقابلہ اور اثر کی وجہ سے ناکامی رہی لیکن سر سید کی رحلت کے ۲ سال بعد پھر اپریل ۱۹۰۰ء میں سر انٹونی کی گورنمنٹ نے ایک رزولیوشن کے ذریعہ سے ہندوؤں کے مطالبات کو منظور کر لیا جس سے مسلمانوں میں ایک عام ہیجان پیدا ہو گیا۔ انہوں نے نہایت سخت احتجاجی جلسے کئے اور بالآخر سر جیمس لاٹوش کے زمانہ میں کسی قدر نرمی سے ایک حد تک مسلمانوں کی اشک شوئی ہوئی' یہ امر بھی قابل اظہار ہے کہ لکھنؤ کے مشہور جلسہ حمایت اردو میں عیسائی اور ہندو اور خاص کر کشمیری پنڈت بھی شریک تھے اور ان میں سے بعض نے رزولیوشن کی تحریک و تائید میں بھی حصہ لیا سر سید کے انتقال کے بعد نواب محسن الملک نے اردو کی حمایت پر کمر باندھی اور لکھنؤ میں جیسا کہ عرض کیا گیا ایک بہت بڑا جلسہ ہوا اور انہوں نے پر جوش تقریر کی۔ نواب محسن الملک نے جو ان جلسوں کے قائد اعظم تھے لفٹننٹ گورنر سے اس مسئلہ پر بالمشافہ گفتگو کی تو اسی وقت ان کی زبانی یہ بات معلوم ہوئی کہ اس صوبہ کے بنگالی بھی ہندی کے مخالف ہیں۔ اسی زمانہ میں صوبہ پنجاب میں بھی مخالف اردو تحریک بڑے زور شور سے اٹھائی گئی' سر چارلس کی خدمت میں ایک زبردست اڈریس پیش کیا گیا لیکن انہوں نے اعداد و واقعات اور مستند آرا کی قوت سے مطالبہ کو نامنظور کر دیا' اسی طرح سندھ میں بھی ترویج ہندی کی کوشش کی گئی لیکن وہاں بھی ناکامی ہوئی۔

اگرچہ صوبہ متحدہ میں اس نزاع سے چند سال پہلے سے مسلمانوں کو اپنی سیاسی تنظیم کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی لیکن انھوں نے کوئی عملی کارروائی نہ کی تھی اس واقعہ نے ان میں ایک جوش پیدا کر دیا اور سیاسی تنظیم کے لئے جد و جہد شروع ہو گئی،

تقسیم بنگالہ کے ضمن میں برادران وطن کے ہاتھوں جو جو مظالم مسلمانوں پر ہوئے اور منٹو مارلے اصلاحات کے اعلان نے اس جد و جہد کو تیز کر دیا، جس کے نتیجہ میں ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد پڑی،

اگرچہ اردو کی ترقی و حفاظت آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور انجمن ترقی اردو کا کام رہا لیکن مسلم لیگ بھی اس کی زبردست محافظ رہی چنانچہ ۱۹۱۱ء کی مدات اتحاد مابین کانگریس و لیگ میں ایک مد "اردو زبان" بھی تھی اس کے بعد ۱۹۱۶ء کے تحفظات (سیف گارڈ) میں بھی اس کو نمایاں جگہ حاصل رہی،

اردو ہندی کا تنازعہ لسانی و ادبی مسئلہ نہیں رہا بلکہ اس نے ایک اہم سیاسی مسئلہ کی شکل اختیار کر لی ہے اور جس قدر گذشتہ ۳۰ سال کے واقعات پر غور کیا جاتا ہے۔ اس سے بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ ہندوؤں کا نصب العین اردو کو مٹا کر ہندی کی ترویج ہے جو براہ راست مسلمانان ہند کے تمدن پر ایک ضرب کاری ہوگی،

(اس نصب العین میں پنڈت مالویہ، گاندھی جی، راجندر بابو، پنڈت نہرو، سب ہی متفق و متحد ہیں) کانگریس نے اگرچہ یہ قرارداد پاس کرا دی ہے۔ کہ اس ملک کی زبان ہندوستانی ہوگی خواہ ناگری حروف میں ہو یا فارسی میں، لیکن ایک طرف تو اس طرح اردو کا تخیل دماغ و ذہن سے نکالنے کی کوشش کی گئی اور دوسری طرف زبان ہندوستانی کا مفہوم اس طرح ٹھونسا جا رہا ہے کہ ہماری اٹھوا ہندوستانی یعنی وہ ہندی جو آگے چلکر ہندوستانی ہونے والی ہے نیا ویل یا تعریف گاندھی جی کے دماغ کی ایجاد ہے پھر گاندھی جی و راجندر بابو وغیرہ کی سرپرستی میں جو تنا ابر جاری ہیں، ان کا مقصد یہی ہے کہ ہندی "راشٹر بھاشا" یعنی قومی زبان تسلیم کی جاوے۔ چنانچہ کاکا کالیلکر نے جو گاندھی جی کے نہایت سرگرم معاون ہیں۔ صاف طور پر اعلان کر دیا ہے کہ ہماری کوشش ہے کہ تمام ہندوستان کی بھاشاؤں کی ابجد ایک ہی ہو اور سب میں ناگری رسم الخط جاری ہو جائے تاکہ وہ اپنے اپنے صوبوں کا کام ناگری میں کریں،

بیگم صاحبہ سید احمد رشید کے مقالہ کے بعد پروفیسر قمر صدیقی صاحب نے صوبہ بنگال کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت کے متعلق اپنا مبسوط و پر از معلومات مقالہ پڑھا، یہ مقالہ پروفیسر صاحب موصوف نے صدر دفتر کانفرنس کی تحریک سے لکھا تھا اور کافی محنت سے تیار کیا گیا تھا، انشاءاللہ علیحدہ شائع ہوگا،

مقالات پڑھے جانے کے بعد مسٹر عبدالرحمٰن صدیقی ایم ایل اے نے ٹرکی کے زلزلہ کے متعلق جس کی خبر روزانہ اخبارات میں شائع ہوچکی تھی چندہ کی تحریک کی اور بتایا کہ یہ کیسا ہولناک واقعہ ہے جس نے ترکوں کو سخت مصائب میں مبتلا کردیا ہے،

پروفیسر عبدالقادر صاحب پشاوری اور خاں صاحب سید احمد رشید صاحب نے اس تحریک کی تائید میں تقریریں کیں حاضرین اجلاس اس واقعہ سے بہت متأثر معلوم ہوتے تھے اس لئے سب کی طرف سے اس تحریک امداد کی تائید کی گئی،

تحریک و تائید کے بعد مولانا سید سلیمان صاحب صدر اجلاس نے یہ فرمایا کہ یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جو تجویز اس وقت پیش کی گئی ہے اس کا اعادہ رات کے کھلے اجلاس میں کیا جائے، اور مسلمانوں سے چندہ کے لئے اپیل کی جائے چنانچہ جناب صدر کی تجویز کے مطابق مزید کارروائی رات کے جلسہ کے لئے ملتوی کی گئی،

اس کے بعد خان بہادر بدرالدین صاحب نے حسب ذیل رزولیوشن پیش کیا،

رزولیوشن نمبر۱

"آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا یہ اجلاس گورنمنٹ سے درخواست کرتا ہے کہ صوبہ کی درسگاہوں میں اردو کی تعلیم اور معلموں کا مناسب اور ضروری انتظام کرے جو اشاعت و تشویق اردو کے لئے لازمی ہے اس مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کانفرنس گورنمنٹ کی خدمت میں یہ تجویز پیش کرتی ہے کہ اردو کے معلموں کے لئے یہ لازمی کردے کہ گورنمنٹ کے مقرر کردہ اردو ڈپلوما اگزامینیشن بورڈ کے ماتحت جو امتحان ہے اس کو وہ پاس کریں"

محرک نے اس رزولیوشن کو پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ لٹریچر کو قوموں کے لٹریچر میں

جس قدر دخل ہے اور کسی چیز کو نہیں ہے لٹریچر میں ہر قوم کی خصوصیات نظر آتی ہیں، اور جس قوم کے لٹریچر کا مطالعہ کیا جاتا ہے اُس کا اثر پڑتا ہے، عربی، فارسی زبانیں ہندوستان میں اب ایک مُردہ زبان کی حیثیت رکھتی ہیں، اب بچے محض نام کے لئے عربی، فارسی کی تعلیم حاصل کرتے ہیں، انگریزی حکومت کے زمانہ میں یہ درجہ اس صوبہ میں بنگالی زبان کو دیدیا گیا ہے، اس لیے مسلمان اسلامی مرکز سے ہٹتے جاتے ہیں اور اسی بنا پر یہاں کے مسلمان رفتار، کردار، گفتار میں ہندوؤں سے زیادہ مشابہ ہیں یہ حالت نہایت افسوسناک اور ناخوشگوار ہے، میں خیالی باتیں نہیں بلکہ واقعات بیان کر رہا ہوں، میں خود ایک بنگالی مسلمان ہوں اس لئے یہ نہ سمجھئے کہ کسی غیر صوبہ کا شخص بنگالیوں پر چوٹ کر رہا ہے، میرے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جہاں کسی اسلامی زبان کی تعلیم نہ دی جاتی ہو وہاں اسلامی چیزیں فنا ہو جائیں گی،

حضرات! اردو کی تعلیم کا انتظام کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ لائق اساتذہ کا انتظام کیا جائے، ورنہ طلبہ پر اس کا بہت بڑا اثر پڑیگا، بنگال میں مسلمانوں کو اردو کی طرف سے اس لئے بیدلی ہوئی کہ انھوں نے یہ دیکھا کہ ان کے بچے پانچ پانچ چھ چھ سال تک اُردو پڑھتے رہے مگر انھیں کچھ نہ آیا، کیونکہ اس صوبہ میں اُردو کی تعلیم اس طرح دی جاتی ہے جس طرح کسی غیر زبان کی، جب یہ صورت ہو کہ اردو کی تعلیم کے لئے وہ مولوی مقرر کئے جائیں جنھوں نے صرف عربی فارسی پڑھی ہے اور اُردو کا کوئی امتحان نہیں دیا ہے، تو اس کا نتیجہ اور کیا ہوگا، بنگالی مسلمان جو سب زبانیں سیکھ سکتے ہیں آخر اردو سیکھنے میں کیا مصیبت ہے، جو اس کو نہیں سیکھ سکتے، بات یہ ہے کہ اُردو پڑھانے والوں کا انتظام نہ ہوگا تو لوگ کس طرح پڑھیں گے لہذا ضرورت ہے کہ اُردو پڑھانے کے لئے وہ استاد مقرر کئے جائیں جنھوں نے اردو کا امتحان دیا ہے،

خاں صاحب سید احمد رشید کی تائید کے بعد رزولیوشن منظور ہوا،

اس کے بعد مولوی عبد السبحان صاحب نے حسب ذیل رزولیوشن پیش کیا،

رزولیوشن نمبر

"چونکہ صوبہ اڑیسہ میں اڑیا بطور مادری زبان ذریعہ تعلیم ہے،

اس لئے یہ کانفرنس گورنمنٹ اڑیسہ سے سفارش کرتی ہے کہ وہ مسلمانوں کے لئے اردو تعلیم کا بھی معقول انتظام کرے"

وحیدی صاحب اڈیٹر عصر جدید کی تائید کے بعد رزولیوشن بالاتفاق منظور ہوا، بعد ازاں پروفیسر طاہر جمیل صاحب نے حسب ذیل رزولیوشن پیش کیا،

رزولیوشن نمبر ۳

"یہ کانفرنس گورنمنٹ بنگال پر زور دیتی ہے کہ وہ تمام گورنمنٹ اور امدادی اسکولوں میں اردو کو بطور ثانوی تعلیم داخل کرنے کا فوری اور معقول انتظام کرے"

پروفیسر قمر صدیقی صاحب کی تائید کے بعد رزولیوشن منظور ہوا، اس کے بعد ابوالمظفر احمد صاحب ٹریژرر ڈھاکہ یونیورسٹی نے حسب ذیل رزولیوشن پیش کیا،

رزولیوشن نمبر ۴

"یہ کانفرنس ڈھاکہ یونیورسٹی کے انٹرمیڈیٹ اور سکنڈری ایجوکیشن بورڈ کے جدید نصاب تعلیم پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتی ہے کیونکہ اس میں اُن طالبعلموں کے لئے جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے اُردو کو بطور ثانوی زبان لینے کا انتظام نہیں کیا گیا ہے، نیز یہ کانفرنس گورنمنٹ پر زور دیتی ہے کہ وہ اُردو کو بورڈ مذکور کی مستند ادبی زبانوں میں جلد از جلد شامل کر دے"

تائید کے بعد یہ رزولیوشن بالاتفاق منظور ہوا، اس کے بعد مولوی ذوالفقار علی صاحب نے حسب ذیل رزولیوشن پیش کیا،

رزولیوشن نمبر ۵

"چونکہ زبان بنگلہ کو عربی رسم الخط میں لکھنے کا رواج ایک صدی

قبل بھی صوبہ بنگال کے مسلمانوں میں جاری تھا لیکن تغیر زمانہ نے اس کو ایک حد تک کالعدم کر دیا اور اس تغیر سے مسلمانان بنگال کی تعلیم وتمدن کو سخت صدمہ پہنچا' لہٰذا آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اس اجلاس کی درخواست ہے کہ حکومت بنگال موجودہ رسم الخط کے ساتھ عربی رسم الخط کو بھی بنگلہ زبان کی تحریر کے لئے رواج دینے کی اجازت دے''

''چودھری نبی احمد صاحب اڈیٹر محمدی نے رزولیوشن کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ جو رزولیوشن اس وقت پیش کیا گیا ہے یہ انقلاب انگیز ہے اور انقلاب ہی کے پیدا کرنے کے لئے لکھا گیا ہے' لیکن انقلاب اچھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی' بنگالی زبان پہلے عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی جس کے یہ نمونے آپ کے سامنے موجود ہیں''

اس موقع پر محرک نے ایک غیر مطبوعہ کتاب دکھائی جو بنگالی زبان اور عربی رسم الخط میں لکھی گئی تھی محرک نے بیان کیا کہ اس کتاب کے مصنف مسٹر امیر علی کے دوست اور چاٹگام کے رہنے والے تھے'

شاہ عالم نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے یہ معاہدہ کیا تھا کہ مسلمانوں کی زبان و تمدن کو محفوظ رکھا جائے گا' ابتداء میں یہ بنگال میں گلگرسٹ نے اردو کو رائج کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے بعد حکومت کا رویہ بدل گیا اور دارادارہ تصنیفات یک قلم بند کر دیا گیا'

اسی سلسلہ میں آپ نے یہ بھی بیان کیا کہ مسلمانوں کی بنگالی ہندوؤں کی بنگالی زبان سے مختلف ہے' پہلے بنگالی زبان میں عربی و فارسی کے کافی الفاظ تھے لیکن ودیا ساگر نے انھیں نکال دیا'

اس رزولیوشن سے کوئی غلط فہمی نہ ہونی چاہئے مقصد صرف یہ ہے کہ بنگالی زبان کو دونوں رسم الخط میں لکھنے کا اختیار دیا جائے جس طرح کہ سندھ میں عربی اور سندھی دونوں حروف رائج ہیں' چونکہ قرآن مجید کی تعلیم بھی عربی حروف کے ذریعہ سے دی جاتی ہے اس لئے یہ تجویز اور زیادہ مفید ثابت ہوگی'

ابوالاثر حفیظ جالندھری نے اس رزولیوشن کی تائید مزید کی مسٹر عبداللہ المحمود ایم اے نے رزولیوشن کی مخالفت کی اس کے بعد خان بہادر مرزا ابوجعفر صاحب پروفیسر

قمر صدیقی، خان بہادر عبدالستار صاحب، خان بہادر ابوالمظفر احمد صاحب نے اصل رزولیوشن کی مزید تائید کی، جس پر عبداللہ المحمود صاحب نے اپنی مخالفت واپس لی اور رزولیوشن پاس ہوا۔

مندرجہ بالا رزولیوشن کے منظور ہونے پر صدر اجلاس مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے اظہار مسرت کیا اور فرمایا کہ یہ تجویز پورے اجلاس کا ماحصل ہے اگر اس میں کامیابی ہوئی تو نہایت مفید نتیجے پیدا ہوں گے مندرجہ بالا کارروائی کے بعد شعبہ اردو کا اجلاس ختم ہوا۔

اجلاس شعبہ اصلاح معاشرت

صدر۔ مولوی حاجی ابوالحسن صاحب

۳۱۔ دسمبر کو بوقت ۳ بجے سہ پہر شعبہ اصلاح معاشرت کا اجلاس تلاوت کلام مجید سے شروع ہوا۔ اس کے بعد ڈاکٹر عبدالعزیز پوری صاحب (مسلم یونیورسٹی) نے مولوی حاجی ابوالحسن صاحب سابق ڈائرکٹر تعلیمات ریاست کشمیر کا نام صدارت کے لئے پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت میں دوسری نوعیت سے حاضر ہوا ہوں۔ یہ امر میرے لئے باعث سعادت ہے کہ میں انکے لئے صدارت کی تحریک کروں علی گڑھ میں اُن کا نام کسی شخص کے لئے بھی محتاج تعارف نہیں۔ وہ ان تعلیمیافتہ اصحاب میں ہیں جن کو ہم بطور نمونہ پیش کر سکتے ہیں۔

مولوی ابوالحسن صاحب علی گڑھ تحریک کے دلدادہ ہیں، اور ایم اے او کالج کے سب سے پہلے ہندوستانی پروفیسر ہیں جو اپنی انتظامی اور ذہنی قابلیت کے لحاظ سے ممتاز رہے، وہ ہمیشہ کالج کے آنریری سکرٹری کے دست راست رہے۔ اس کے بعد یو پی گورنمنٹ کو اُن کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا، وہ صوبے کے ممتاز تعلیمی عہدہ دار رہے تھے، اور انھوں نے اپنی خدمات بہت عمدہ طریقہ سے انجام دیں۔ اس کے بعد آپ ریاست کشمیر کے ڈائرکٹر سررشتہ تعلیمات مقرر ہوئے جہاں آپ نے تعلیم کی ترقی و اشاعت

کے لئے خاص کوشش کی، آپ مسلم یونیورسٹی اگزیکیٹو کونسل کے ممبر بھی ہیں، جس میں ہمیشہ پابندی سے شریک ہوتے ہیں یہاں تک گرمی کے سخت موسم میں راحت و آرام چھوڑ کر سولن سے علی گڑھ آتے ہیں۔ غرض مختلف خصوصیات کے لحاظ سے مولوی ابوالحسن صاحب اس اجلاس کی صدارت کے لئے نہایت موزوں ہیں اس لئے میں بڑی خوشی سے مولوی صاحب ممدوح کی صدارت کے لئے تحریک کرتا ہوں،

خانصاحب سید احمد رشید کی تائید کے بعد مولوی حاجی ابوالحسن صاحب اجلاس کے صدر قرار پائے، مولوی صاحب موصوف چونکہ پہلے سے "شعبہ اصلاح معاشرت" کی صدارت کے لئے نامزد تھے بلکہ مجوزہ صدر کے تشریف نہ لاسکنے کی وجہ سے آپ سے صدارت کے لئے درخواست کی گئی تھی، اس لئے آپ کو خطبہ صدارت تحریر کرنے کا موقع نہیں ملا، چنانچہ جناب ممدوح نے اپنی افتتاحی تقریر یا برجستہ خطبہ صدارت میں اس طرف اشارہ بھی فرمایا کہ کن حالات میں آپ کو اس اجلاس کی صدارت کے لئے آمادہ ہونا پڑا، جبکہ آپ صرف اجلاس کی شرکت کے لئے آئے تھے، اور آپ کے فرشتوں کو بھی یہ خبر نہ تھی کہ کسی اجلاس کی صدارت بھی کرنی پڑے گی۔ آپ نے فرمایا کہ بعض بزرگوں نے جن سے ۳۰ برس سے نیازمندانہ تعلقات ہیں یہ حکم دیا کہ مجھے ایک نہ ایک اجلاس کی صدارت کرنی پڑے گی اس لئے میں مجبور ہوگیا لیکن پھر کل شام کو مجھے معلوم ہوا کہ مجوزہ صدر صاحب کی تشریف نہ لانے کی وجہ سے اس شعبہ کا اجلاس ملتوی ہو جائے گا اس لئے میں رات کو اطمینان سے سویا لیکن صبح آکر کیا دیکھتا ہوں کہ اس اجلاس کا چھپا ہوا پروگرام موجود ہے بہرحال اب صورت واقعہ یہ ہے کہ اگر کچھ بولتا ہوں تو سبکی ہوتی ہے کیونکہ اس کے لئے میں تیار نہیں ہوں لیکن پروگرام کی لاج رکھنی ہے، اس لئے کچھ نہ کچھ تو کہنا پڑے گا،

آجکل تعلیم کی ضرورت و اہمیت کے متعلق بہت کچھ کہا جاتا ہے جو بے شبہ صحیح ہے لیکن ذاتی تجربہ کی بنا پر میرا یہ خیال ہے کہ تعلیم نامکمل رہتی ہے جب تک اس کے ساتھ تربیت نہو، اسی بنا پر ماہرین فن کی یہ رائے ہو کہ تعلیم بغیر تربیت کے ناقص ہے، ایک مشہور ضرب المثل ہے کہ یک من علم را دہ من عقل باید، آپ جانتے ہیں کہ یہ دہ من عقل کس طرح حاصل ہوتی ہے؟ اس طرح کہ تعلیم کے ساتھ اچھی تربیت بھی دی جائے اصلاح معاشر

کا مدار بھی اسی تربیت پر ہے، تربیت کیا ہے؟ مختلف انسانی تعلقات کا صحیح طریقہ سے برتنا، میرے نزدیک انسانی تعلقات کے تین ٹکڑے ہیں یعنی انسان کا ایک تعلق تو اپنی ذات سے ہے جس کو تربیت نفس کے ساتھ تعبیر کیا جا سکتا ہے دوسرا تعلق اپنے ماحول سے ہے یعنی والدین اولاد اور عزیز و اقارب سے تعلقات، یعنی ان تعلقات کو مناسب و صحیح طریقہ سے برتنا و نباہنا۔ ان تعلقات کے علاوہ انسان کا تیسرا تعلق خدا کے ساتھ ہے، جس کی حقیقت سمجھنے کے لئے صحابہ کرام اور بزرگان سلف کی زندگی پیش نظر رکھنی چاہیئے جو ہمارے لئے ایک نمونہ کا کام دے گی، میں نہ اس کا اہل ہوں نہ اس کے متعلق کچھ کہہ سکتا ہوں، اس تعلق کو یعنی عبد و معبود کے تعلقات کی حقیقت کو خود اللہ تعالیٰ نے ایاک نعبدُ و ایاک نستعین کے الفاظ سے ظاہر فرما دیا ہے، جس سے اسلامی توحید کی صحیح حقیقت ظاہر ہوتی ہے، مقصد یہ ہے کہ بندہ صرف خدا ہی کی عبادت کرے اور سب سے بے نیاز ہو کر ہر معاملہ میں انہی سے امداد کا طالب ہو، کیونکہ انسانی اخلاق کی بلندی و برتری صرف اسی طرح ظاہر ہو سکتی ہے کہ بندہ ایک خدائے یگانہ و توانا کے سوا اور کسی کی پرستش نہ کرے نہ کسی کے سامنے سر اطاعت خم کرے، نیز یہ کہ جو کچھ مانگے، کسی فانی ہستی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے،

اب رہی تعلقات کی دوسری قسم یعنی دوسرے انسانوں کے ساتھ کس طرح کے تعلقات رکھے جائیں؟ یہی معاشرت کہلاتی ہے، اور اسی کی اصلاح مقصود ہے، اور اسی سلسلہ میں اپنی ذات اور اپنے نفس کی اصلاح و تربیت بھی ہے۔ ان سب چیزوں کے متعلق اسلام کے احکام و تعلیم موجود ہے لیکن اب دنیا کی معاشرت بدل گئی ہے اور اور ہم اس سبق کو بھول گئے ہیں جو اسلام نے ہمیں سکھایا تھا، اس لئے روز بروز ہمیں تنزل ہو رہا ہے، مثلاً اسلام نے سادگی، کفایت شعاری، اور اعتدال کی تعلیم دی تھی لیکن مسلمان کی حالت یہ ہے کہ وہ جس قدر کماتا ہے اس سے زیادہ خرچ کر دیتا ہے اور اس کی وجہ سے برباد ہو جاتا ہے، میں نے بہت کم مسلمان ایسے دیکھے جو آمد و خرچ کا موازنہ قائم رکھ سکتے ہوں، بڑی بڑی تنخواہ پانے والے عہدہ داروں کی بھی یہی حالت ہے برخلاف ان کے دوسری قوموں کی یہ حالت ہے کہ اُن کا ایک چپراسی تک کچھ نہ کچھ پس انداز کرتا ہے، ہم دوسروں سے زیادہ راحت پسند ہیں اس لئے

ہمارے ذاتی اخراجات زیادہ ہیں اور بہت سے موقعوں پر ہمیں خودداری کا بھی ضرورت سے زیادہ لحاظ رہتا ہے پھر ان سب کے علاوہ رسومات کا دُم چھلا بھی ہمارے ساتھ لگا ہوا ہے غرض حالت یہ ہے کہ مسلمان آرام طلب اور مسرف ہیں اور کسی کام کو ہمت و استقلال کے ساتھ انجام نہیں دیتے دوسری قومیں ہماری اس حالت پر ہنستی ہیں لیکن ہمیں ذرا بھی پروا نہیں،

حضرات اسلام نے روپیہ کمانے اور دولت حاصل کرنے کو منع نہیں کیا ہے، بشرطیکہ وہ صحیح موقع پر خرچ کی جائے، حضرت عثمان غنیؓ کا نام سب مسلمان جانتے ہیں اُن کو "غنی" اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ دولتمند تھے لیکن اپنی دولت جائز طریقہ سے کماتے اور مفید کاموں میں صرف کرتے تھے،

بہرحال اسلام کی تعلیم پر عمل نہ کرنے سے ہماری **معاشرت** اور روزمرہ کی زندگی میں جو خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں اُن کے دور کرنے کی ضرورت ہے اور اسی کا نام "اصلاح معاشرت" ہے جس کے لئے ہم سب کوشش کر رہے ہیں، اب چونکہ اجلاس میں اور بہت سے ضروری کام انجام دئے جائیں گے اس لئے میں اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں،

جناب صدر کی تقریر کے بعد مسٹر **امیرالدین احمد** ایم اے بی ایل ایڈوکیٹ ہائیکورٹ نے حسب ذیل رزولیوشن پیش کیا،

رزلیوشن نمبرا

"آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اس جلسہ کی رائے میں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانان ہندوستان کے مروجہ لباسوں میں ایسی اصلاحات کی جائیں جن سے مسلمانوں کا لباس حتی الامکان امتیازی اور یکساں ہو جائے، اور اس مقصد کے تحت میں یہ تجویز پیش کرتا ہے کہ اس موضوع پر غور و خوض کرنے کے لئے کانفرنس اپنی ایک سب کمیٹی قائم کرے جو اپنی رپورٹ کانفرنس کے آئندہ سالانہ اجلاس میں پیش کرے"

اس رزولیوشن کو پیش کرتے ہوئے محرک نے بیان کیا کہ لباس ہماری معاشرت کا ایک جزو ہے، یہ ظاہر ہے کہ تمام عالم میں مقتدر قومیں اپنا ایک قومی لباس رکھتی ہیں،

لیکن بد قسمتی سے ہندوستانی مسلمانوں کا کوئی ایک لباس نہیں ہے، ترکی، مصری، اور دوسرے ممالک کے مسلمان بھی سب اپنا اپنا لباس پہنتے ہیں لیکن ہماری حالت یہ ہے کہ کسی مجلس میں جاکر دیکھئے تو عام لباس اور ٹوپی میں عجیب گوناگونی نظر آتی ہے،

ہمارا مذہب یہ سکھاتا ہے کہ سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، لیکن جب اختلاف لباس کی وجہ سے ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی صورت دیکھ کر یہ نہ پہچان سکے کہ یہ ہمارے مذہب کا آدمی ہے تو وہ اس سے کیا ہمدردی کر سکتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی ضروری ہے کہ مسلمانوں کے لباس میں کوئی ایسا امتیاز وخصوصیت ہو کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو دیکھ کر پہچان سکے کہ یہ ہمارا بھائی ہے، مقصد یہ ہے کہ ہمیں وہ تمام طریقے برتنے چاہئیں جن سے مسلمانوں کے باہم اتحاد پیدا ہو، اسلام نے اس کی خاص کوشش کی ہے مثلاً نماز باجماعت خصوصاً جمعہ وعیدین کی جماعت اور حج کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اس طرح مسلمان ایک دوسرے سے ملیں اور ان کی برادری قائم ہو جائے، اسی طرح آج صبح اردو زبان کی اہمیت پر جو مختلف تقریریں ہوئیں اُن کا بھی مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے آپس میں تعلقات پیدا ہوں کیونکہ زبان کی یکسانیت بھی اتحاد کا ایک بڑا ذریعہ ہے،

سلسلہ تقریر میں آپ نے یہ بھی بتایا کہ لباس کے اختلاف کی وجہ سے بعض دفعہ عجیب دھوکہ ہوتا ہے اور سفر میں اکثر ایسے واقعات پیش آئے ہیں کہ ایک مسلمان کو ہم کرسٹان سمجھ رہے ہیں اور اسی بنا پر اس سے مخاطب نہیں ہوتے، لیکن جب یہ غلطی معلوم ہوتی ہے تو افسوس ہوتا ہے،

اس تحریک سے میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ مسلمان اپنے سارے لباس کو از سرتاپا بالکل بدل دیں، بلکہ اُن کے لباس میں کوئی ایسی چیز ضرور مشترک ہونی چاہئے جس سے یہ معلوم ہو کہ وہ مسلمان ہیں،

تائید کے بعد رزولیوشن منظور ہوا،

اس کے بعد مولوی قمر الدین قمر جھنگوی نے حسب ذیل رزولیوشن پیش کیا،

رزولیوشن نمبر۲

دی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس مسلمانوں کی موجودہ اقتصادی و مالی تباہ حالیوں پر نظر رکھتے ہوئے تجویز کرتی ہے کہ اب ہمارے بچوں کو کتابی نصاب کے علاوہ ہر جگہ صنعتی و حرفتی کام سکھانے کے لئے شعبہ جات کھولے جانے کا خاطر خواہ انتظام کیا جائے اور اس اہم مقصد کی تکمیل کے لئے یہ کانفرنس مسلمانوں سے اپیل کرتی ہے کہ وہ مالی امداد کی طرف خصوصی توجہ کریں۔

قمر صاحب نے اس رزولیوشن کو پیش کرتے ہوئے بیان کیا کہ اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس رزولیوشن کی ضرورت کیا ہے؟ اس کے متعلق میں نہایت ادب سے یہ عرض کروں گا کہ قدیم علوم ہوں یا جدید علوم و فنون اُن کی ضرورت سے انکار نہیں ہو سکتا، علم کا سیکھنا ہر فرد و بشر کے لئے لازم و ضروری ہے لیکن ان سب علوم کی ڈگریاں حاصل کر لینے کے بعد بھی انسان کے سامنے ایک اہم سوال باقی رہ جاتا ہے اور وہ سوال روزی اور پیٹ کا ہے۔

علم کا مقصد روزی کمانا نہیں ہے علم بجائے خود ایک مقصود حقیقی ہے اس لئے ہمیشہ علم صرف علم کے لئے حاصل کیا جاتا تھا نہ کہ نوکریوں کے لئے جیسا کہ اس زمانہ میں لوگوں نے علم کا مقصد قرار دے لیا ہے، جب علم کا مقصد روپیہ کمانا نہیں ہے تو ضرورت ہے کہ مسلمان حصول معاش کے لئے تجارتی کاروبار اور صنعت و حرفت پر توجہ کریں۔

ایک زمانہ ایسا تھا کہ مسلمان تجارت اور صنعت و حرفت میں امام زمانہ تھے، لیکن آج ہندی مسلمانوں کو تجارت و صنعت کی طرف سے جو غفلت ہے وہ ہمارے سامنے ہے اسی لئے افلاس روز بروز بڑھ رہا ہے، اب مسلمان اپنی اس کمزوری کو محسوس کرنے لگے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کچھ کریں، مگر کیا کریں اور کیسے کریں انھوں نے کچھ سیکھا نہیں، رہی تجارت تو اس کے لئے سرمایہ نہ ہونے کا عذر کیا جاتا ہے، لہٰذا ضرورت ہے کہ مسلمانوں کو صنعت و حرفت کی تعلیم دی جائے، کسب معاش کے لئے صنعتی تعلیم ضروری ہے، آج ملک انقلاب کے دور سے گزر رہا ہے، اگر مسلمان غافل رہے اور اس میں حصہ نہ لیا تو نقصان اٹھائیں گے۔

قمر صاحب کے بعد وحیدی صاحب اڈیٹر عصر جدید کلکتہ نے اس رزولیوشن کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کی بیکاری و بیروزگاری اس قدر بڑھ گئی ہے کہ لوگ

تعلیم کے مخالف ہو گئے ہیں اور یہ سوچنے لگے ہیں کہ اس تعلیم سے کیا حاصل، میرے پاس اس قسم کے سینکڑوں خطوط آچکے ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوان بیکاری کی وجہ سے کس قدر پریشان حال ہیں، مسلمانوں میں اچھے اچھے صناع و کاریگر تھے، دوسرے لوگوں نے بھی مسلمانوں سے یہ چیزیں سیکھیں اور فائدہ حاصل کیا، لیکن بدقسمتی سے خود مسلمان ہر قسم کے فائدوں سے محروم ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ پھر اس طرف توجہ کی جائے اور صنعتی تعلیم کے ساتھ اس کی ٹریننگ کا بھی معقول بندوبست کیا جائے، صنعتی تعلیم لازمی اور ضروری ہونی چاہیئے، مسلمان جہاں کہیں بھی مکتب قائم کریں اس کے ساتھ ہی لڑکوں کو کچھ نہ کچھ صنعت و حرفت کی تعلیم بھی دیں جس سے خاص فائدہ حاصل ہوگا،

تائیدی تقریر کے بعد رزولیوشن بالاتفاق منظور ہوا، اور اسی پر شعبہ اصلاح معاشرت ختم ہوا،

اجلاس عام کانفرنس

۳۱ دسمبر ۱۹۳۹ء بوقت ۹ بجے شب

اجلاس شروع ہونے پر آنریبل عزیز الحق صاحب وائس چانسلر کلکتہ یونیورسٹی نے حسب ذیل رزولیوشن پیش کیا،

رزولیوشن نمبر ۱

"یہ کانفرنس ٹرکی کے بہادر مسلمانوں پر زلزلہ سے جو حادثہ عظیم پیش آیا ہے اور جس سے سینکڑوں شہر و دیہات برباد اور ہزاروں قیمتی جانوں کا اتلاف ہوا ہے اس پر اپنے دلی رنج و صدمہ کا اظہار کرتی ہے اور خدائے قادر و توانا سے دست بدعا ہے کہ وہ بہادر ٹرکی قوم کو اس سانحہ کو صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے نیز یہ کانفرنس اپنے صدر کو مجاز کرتی ہے کہ وہ صدر جمہوریہ ترکی کو اس کی عمیق ہمدردی کا پیغام ارسال کرے"

مسٹر عبد الرحمٰن صدیقی ایم ایل اے نے اس رزولیوشن کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ جس رزولیوشن کے متعلق آج صبح گفتگو ہوئی تھی اب دوبارہ آپ بھائیوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے ہندوستان والوں کو یاد ہوگا کہ بہار اور کوئٹہ میں جو زلزلہ آیا تھا اُس نے لوگوں کو کیسے شدید مصائب میں مبتلا کر دیا تھا اب اسی مصیبت میں ہمارے ترکی بھائی بھی مبتلا ہو گئے ہیں، بلکہ اُن کی مصیبت ہم سے بھی بڑھ کر ہے کیونکہ سردی کی بھی شدت ہے اور لوگ بالکل بے پناہ اور خانماں برباد ہیں، زلزلہ کی شدت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہزاروں جانیں دفعتاً ضائع ہو گئیں، مکانات گر گئے، ریلیں تک ٹوٹ پھوٹ گئیں، اور یہ مصیبت ایسے وقت میں پیش آئی جبکہ دنیا میں جنگ چھڑی ہوئی ہے اور ترکی خطرہ کی حالت میں ہے، اور یہ اندیشہ ہے کہ کوئی حریف اس پر حملہ نہ کر دے،

اس وقت ترکی ایسی مصیبت میں ہے کہ اُس کے دشمن بھی اُس سے ہمدردی کر رہے ہیں اور مالی امداد کے علاوہ دوسرے ذرائع سے بھی اُس کو امداد پہنچا رہے ہیں لہٰذا مسلمانوں کو تو خصوصیت کے ساتھ ترکی کی روپیہ سے امداد کرنی چاہئیے تاکہ جو مصیبت پیش آئی ہے اُس کی کچھ تلافی ہو سکے، ورنہ اندیشہ ہے کہ کہیں ترکی کا کوئی دشمن اس کی کمزوری سے اس موقع پر فائدہ نہ اٹھائے،

گذشتہ جنگ عظیم کے بعد ترکی ایک تباہ شدہ سلطنت تھی، لیکن ترکوں نے مسلسل ۲۵ برس جد و جہد کر کے اور ہر قسم کی تکالیف اٹھا کر اور اپنا پیٹ کاٹ کر اس تباہ سلطنت کو ترقی دی، اور اس کی جنگی قوت کو مستحکم کیا، ہمیں اس موقع پر صرف رزولیوشن ہی نہیں پاس کرنا چاہئیے بلکہ چندہ جمع کر کے عصمت پاشا کی خدمت میں بھیجنا چاہئیے،

مولوی عبد الحامد صاحب قادری بدایونی نے اس رزولیوشن کی تائید مزید کی، اس کے بعد چندہ شروع ہو گیا جس کا سلسلہ دیر تک جاری رہا،

اسی دوران میں جبکہ چندہ کا سلسلہ جاری تھا، اور لوگ اپنے عطیات کا اعلان کر رہے تھے یا اپنے چندہ کی رقوم لا کر صدر کی میز پر رکھ رہے تھے، سید الطاف علی صاحب اسسٹنٹ دفتر کانفرنس نے آنریری سکرٹری کانفرنس کی رپورٹ پڑھ کر سنائی جو منظور ہوئی، یہ "رپورٹ" اس سالانہ رپورٹ کے آخر میں شامل ہے،

اس موقع پر جو چندہ جمع ہوا اُس کی مقدار دس ہزار روپیہ تک پہنچ گئی، چندہ کی خاص خاص رقوم ذیل میں شائع کی جاتی ہیں،،

نواب کمال یار جنگ صدر اجلاس کانفرنس	۵۰۰
آنریبل ابو القاسم فضل الحق صاحب وزیر اعظم	الف
آنریبل حسین شہید سہروردی وزیر بنگال	۵۰۰
سر آدم جی حاجی داؤد	۱۵۰۰
سیٹھ عبد الرحیم صاحب	۵۰۰
مسٹر ولی محمد قاسم دادا	۵۰۰
حاجی قادر بخش حاضر بخش	۵۰۰
مسٹر محمد رفیق صاحب	۲۵۰
سیٹھ محمد امین صاحب	۲۵۰
سیٹھ محمد اسمٰعیل صاحب	۲۵۰
بیگم صاحبہ نواب کمال یار جنگ بہادر	۲۵۰
نواب صدر یار جنگ بہادر	۲۰۰
سیٹھ عبد الرزاق صاحب	۲۰۰
حاجی محمد سعید صاحب	۱۵۰
آنریبل عزیز الحق صاحب	۱۰۰
مسٹر قیصر آف باٹا کمپنی	۱۰۰
فضل کریم صاحب آئی، سی، ایس	۱۰۰
محمد شریف صاحب	۱۰۰
خان بہادر عبد المومن صاحب	۱۰۰
مسٹر امجد علی مالک امجدیہ ہوٹل	۱۰۰

مندرجہ بالا اصحاب کے علاوہ اور بہت سے حاضرین مجلس نے چندہ کی مختلف رقوم عطا کیں یا ان کا اعلان کیا، جب چندہ کی مقدار تقریباً نو ہزار روپیہ پہنچ گئی اور کوئی مزید اعلان نہیں ہوا، تو مسٹر عبد الرحمٰن صدیقی ایم ایل اے نے یہ فرمایا کہ ایک صاحب جو اپنا نام

ظاہر کرنا نہیں چاہتے دس ہزار روپیہ میں کمی رہ گئی ہے وہ پوری کرتے ہیں تاکہ چندہ کی رقم دس ہزار ہو جائے، اس اعلان پر اجلاس نے اظہار مسرت کیا،

چندہ کے آغاز سے پہلے پنجاب کے مشہور شاعر **ابو الاثر حفیظ** جالندھری نے اپنا کلام سنانے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، وہ چندہ کے دوران میں بھی جاری رہا، اور حفیظ صاحب نے لوگوں کو چندہ دینے کے لئے بار بار ترغیب دی، اور یہ اعلان کیا کہ جب تک چندہ کی رقم دس ہزار نہیں ہو جائے گی وہ کوئی نظم نہیں پڑھیں گے، حاضرین مجلس جو اس وقت **حفیظ** صاحب کی نظم سے بہت لطف اندوز ہو رہے تھے اس اعلان سے کافی طور پر متأثر ہوئے اور چندہ کی رفتار تیز ہو گئی، چندہ کے درمیان میں آنریبل **ابو القاسم فضل الحق** صاحب نے بھی مسلمانوں کو ترغیب دی کہ وہ اس مصیبت کے موقع پر شہر کی حکومت کی زیادہ سے زیادہ مدد کریں، اس ترغیب کا بھی لوگوں پر کافی اثر ہوا،

اس موقع پر ناظرین کی اطلاع کے لئے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اگرچہ اجلاس میں کم و بیش دس ہزار چندہ ہوا، لیکن اسی موقع پر زیر نگرانی آنریبل عزیز الحق صاحب ایک کمیٹی بنا دی گئی جس نے اجلاس کے بعد بھی اپنا کام برابر جاری رکھا اور ایک گراں قدر رقم جمع کر لی، لیکن یہ کارروائی چونکہ اجلاس کے بعد ہوئی اس لئے رپورٹ میں اس کی تفصیلی کیفیت نظر انداز کی جاتی ہے،

جب اجلاس میں چندہ کی کارروائی ختم ہو گئی تو صدر اجلاس **نواب کمال یار جنگ بہادر** نے اجلاس کے سہ روزہ کام پر حسب ذیل تبصرہ فرمایا،

معزز **حاضرین** میں اس وقت اس غرض سے آپ کے روبرو کھڑا ہوا ہوں کہ اس اجلاس کی روداد پر ایک مختصر تبصرہ کر دوں،

حضرات۔ یہ امر اب محتاج بحث نہیں رہا کہ مسلمان بچوں کے لئے جو بھی نظام تعلیم تجویز ہو۔ اس کی بنیاد اسلامیات پر ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسے نظام تعلیم کی ترتیب دہی میں ہر صوبہ کی خاص ضروریات اور بالخصوص معاشی ضروریات کا لحاظ رکھا جانا ضروری اور ناگزیر ہو گا۔ مجھے امید ہے کہ کل کے اجلاس میں جس قرارداد کو آپ نے منظور فرمایا ہے اور جس کے نتیجہ کے طور پر ماہرین کی ایک تحقیقاتی اور دورہ کنندہ کمیٹی تشکیل پائے گی وہ نہایت ذمہ داری و سنجیدگی کے ساتھ مسلمانوں کے "نظام تعلیم"

سے متعلق اپنی غور کردہ رائے پیش کرے گی، یہ کمیٹی جہاں جہاں دورہ کرے گی مقامی ماہرین معاشیات وتعلیمات کے آراء سے پورا پورا استفادہ کرے گی"

حضرات۔ واردھا اسکیم یا کسی اور اسکیم سے محض اپنی ناراضگی ظاہر کرکے خاموش ہو جانا قطعاً ناکافی ہے تعمیری تنقید کا مؤثر ترین طریقہ یہی ہے کہ ہم ایک ایسی اسکیم مرتب کر دیں جو ہندو وسنائی قومیت کو حتی الامکان مجروح کئے بغیر ہماری اسلامی روایات کی برقراری پوری پوری ضمانت دے سکے۔

حضرات۔ میری رائے میں یہ چیز قطعاً ممکن ہے ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ہم ٹھنڈے دل سے اس مسئلہ پر غور کریں اور مسلمانوں کی مذہبی تعلیم، معاشی ضروریات کو پیش نظر رکھیں۔

حضرات۔ اس اسکیم کی تیاری کے علاوہ ایک اور مسئلہ ہے جس کی جانب قدم اٹھانے کی ضرورت ہے اور وہ مسلمانوں کی خیرات، ان کی زکوٰۃ اور ان کے اوقاف کی تنظیم ہے۔

میں واقف ہوں کہ بعض صوبوں میں اوقاف سے متعلق کچھ کام ضرور ہوا ہے لیکن ان کوششوں کو خاطر خواہ نہیں کہا جا سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر مسلم لیگ بھی اس مسئلہ میں دلچسپی لے تو تشفی بخش نتائج برآمد ہونے کا امکان ہے۔

تیسرا مسئلہ جس کی جانب ہمیں توجہ کرنی ہے وہ زبان اردو کی حفاظت ہے۔ زبان اردو تنہا ہماری میراث نہیں ہے یہ ہندو اور مسلمانوں کی مشترکہ میراث ہے لیکن ہمارے ہم وطن بھائیوں کو بلا وجہ اس زبان سے ایک کد سی ہو گئی ہے اگر خدانخواستہ اردو زبان مٹادی جائے اور وہ ہندی اس کی جگہ لے لے جس کی چند تفصیلی مثالیں مولانا عبدالماجد صاحب بدایونی نے پرسوں شام پیش کی تھیں۔ تو یقین جانئے کہ مسلمان خسارہ میں رہے گا لیکن الحمدللہ کہ اس گئی گزری حالت میں بھی ہم مسلمانوں میں اتنا کس بل موجود ہے کہ ہم اردو زبان پر جو یورش ہو رہی ہے۔ اس کا انشاء اللہ المستعان نہایت کامیابی کے ساتھ مقابلہ کریں گے۔ اس سلسلہ میں میں خاص طور پر انجمن ترقی اردو اور مولوی عبدالحق صاحب کی خدمات کا اعتراف کرنا ضروری خیال کرتا ہوں، اگر اس نازک موقع پر مولانا مصروف بکار اور سرگرم

عمل نہ ہو جاتے تو ڈر تھا کہ مخالفیں کی کوششیں سرسبز ہو جائیں،
چوتھا مسئلہ جس کی جانب توجہ ضروری ہے۔ وہ مسلمانوں میں صنعتی تعلیم کی ترویج ہے۔ ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان صاحب نے پرسوں کے اجلاس میں جو علی گڑھ میں صنعتی کالج کے قیام سے متعلق جو اپیل کی ہے وہ ہر آئینہ قابل قبول ہے میں ڈاکٹر صاحب کی اپیل کی پرزور تائید کرتا ہوں،

حضرات۔ میں بالآخر آپ سب حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں، کہ آپ نے مجھے نہ صرف صدارت کی عزت بخشی بلکہ اپنے تعاون عمل سے اور میری کوتاہیوں کو نظر انداز فرما کر اس بارگراں کو ہلکا کیا۔ میں آنریبل فضل الحق ارکان مجلس استقبالیہ و رضاکاران مقامی مندوبین کانفرنس نیز مقررین کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی کوششیں اس کانفرنس کو کامیاب بنانے میں پوری طرح معاون رہیں، میں اُن حضرات کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جنھوں نے نہایت فیاضی کے ساتھ ہم سب کی ضیافت کی،

حضرات۔ کمیٹی نظام تعلیم کی صدارت قبول کر کے میں نے ایک بڑی ذمہ داری اپنے سر لی ہے اگر فضل الٰہی اور آپ کی مخلصانہ مساعی شامل حال نہ ہوں تو مجھے ہرگز کامیابی کی امید نہیں،

بالآخر دعا کرتا ہوں کہ ہم سے مسلمانوں کی کچھ خدمت ہو جائے،

جناب صدر کے بعد آنریبل مولوی ابوالقاسم فضل حق صاحب صدر مجلس استقبالیہ نے ایک مختصر اختتامی تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔ حضرات! مجھے اس وقت یہ فخر حاصل ہے کہ آپ کی خدمت میں شکریہ کے چند الفاظ عرض کروں، میں مسلمانان بنگالہ کی طرف سے عموماً اور اپنی طرف سے خصوصاً سب ڈیلی گیٹوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ حضرات تکلیف گوارا کر کے یہاں تشریف لائے اور اس کانفرنس کی شرکت سے ہمیں عزت بخشی،

گذشتہ سال میں نے اجلاس پٹنہ کے موقع پر کانفرنس کو کلکتہ میں سالانہ اجلاس کی دعوت دینے کی جرأت کی تھی، مجھے یہ صلاح خانصاحب سید احمد رشید نے دی تھی اور ایک دو اور مسلمانوں نے بھی یہ مشورہ دیا تھا مجھے اس میں ذرا تامل تھا

لیکن یہ لوگ نہیں مانے اور اصرار کرتے رہے کہ اعلان کردو کہ

در کار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست

پہلے سے یہ ارادہ تھا کہ اسی دسمبر میں کانفرنس کا سالانہ اجلاس کیا جائے گا، لیکن کچھ مدت بعد مسلم لیگ والوں کی طرف سے یہ اعلان ہوا کہ وہ اپنا سالانہ اجلاس دسمبر کے مہینہ میں لاہور میں کریں گے، ہم نے خیال کیا کہ جب کام کرنے والے سب لوگ لاہور چلے جائیں گے تو ہماری کانفرنس کا اجلاس کلکتہ میں ناکامیاب رہے گا، اس لئے یہ ارادہ تھا کہ مارچ یا اپریل میں کانفرنس کا اجلاس کر دیا جائے گا، جس میں ابھی بہت دن باقی ہیں، غرض ہم اسی خواب غفلت میں تھے کہ ابھی وقت بہت ہے کہ دفعتہً اکتوبر میں "مسلم لیگ" نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ اپنا جلسہ مارچ میں کریں گے اس اعلان سے ہم پریشان ہو گئے، اب ہم مسلم لیگ سے لڑ تو سکتے نہیں تھے، اس لئے استخارہ کیا لوگوں سے مشورہ کیا کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے، اسی فکر میں تھے کہ نوجوان بیچ میں کود پڑے اور کہنے لگے کہ آپ تو دعوت دے ہی دیں، اور کوئی فکر نہ کریں، یہ کلکتہ شہر ہے کوئی دشواری نہیں پیش آئے گی ہم سب کام کرنے والے موجود ہیں، چنانچہ ۱۲ نومبر کو میٹنگ ہوئی اور یہ طے پایا کہ کانفرنس کا اجلاس دسمبر کے مہینہ میں کلکتہ میں ہونا چاہیے وقت بہت کم رہ گیا تھا، ادھر ہماری اسمبلی چلنے لگی، میری صحت بھی اچھی نہ تھی پہلو میں درد تھا لیکن میں یہ عذر لنگ پیش نہ کروں گا شاید آپ قبول نہ کریں،

غرض ان حالات کی وجہ سے ہم آپ کی مہمانداری کا ایسا سامان نہ کر سکے جیسا ہمارا دل چاہتا تھا، لیکن مجھے امید ہے کہ آپ اسلامی ہمدردی کی وجہ سے ہمیں اس کوتاہی پر معاف کریں گے اور درگزر فرمائیں گے، بس یوں سمجھئے کہ آج کل جو شخص کسی جلسہ میں شریک ہونے کے لئے سفر کرتا ہے وہ گویا جہاد میں جاتا ہے اور جب جہاد کے میدان میں آ گئے تو پھر تکلیفوں کا خیال نہ کیجئے، ہم نے آپ کو محبت و اخلاص سے دعوت دی اور آپ نے محبت سے قبول کی بس یہ کافی ہے،

میں رضاکاروں کا خاص طور پر شکریہ ادا کرتا ہوں بلکہ ان کے لئے دعا کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ انھیں خدمت قوم کی توفیق دے، شکریہ اس لئے ادا کرتا ہوں

کہ وہ بڑے اچھے لوگ ہیں، میں کئی دفعہ جلاس میں بلاٹکٹ آیا مگر انھوں نے مجھے بالکل نہیں روکا،

جناب صدر کے متعلق میں کیا عرض کر سکتا ہوں وہ زمانہ گذشتہ کے مسلمان اُمرار کا نمونہ ہیں، سچے مسلمان اور ہمدرد قوم ہیں، یہ بھی ان کی ایک قومی خدمت ہے کہ زحمت سفر گوارا کر کے کلکتہ تشریف لائے اور ہماری درخواست پر اس اجلاس کی صدارت قبول فرمائی،

حضرات اب میں آخر میں آپ سب حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میری تقریر صبر و خاموشی کے ساتھ سنی،

آنریبل ابوالقاسم فضل الحق صاحب کے بعد **آنریبل حسین شہید سہروردی** وزیر بنگال و سکرٹری استقبالیہ کمیٹی نے فرمایا،

حضرات میں جانتا ہوں کہ اس جلسہ کے بعد مشاعرہ ہے اور آپ **حفیظ جالندھری** کا کلام سننے کے مشتاق ہیں اس لئے میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لونگا اس وقت میرا ایک فرض یہ ہے کہ مقامی کارکنوں کا شکریہ ادا کروں، لیکن میں اب تک یہ معلوم نہیں کر سکا کہ سب سے زیادہ کام کس نے کیا اور کون سب سے زیادہ شکریہ کا مستحق ہے کیونکہ ہمارے جتنے کارکن تھے سب ہی پہلے درجہ کے کارکن ثابت ہوئے، اور سب نے خوب کام کیا،

اب میں ایک دو لفظ جناب صدر کے متعلق عرض کرنا چاہتا ہوں، لیکن میں کس طرح اُن کا شکریہ ادا کر سکتا ہوں انھوں نے بڑی زحمت گوارا فرمائی، یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ انھوں نے اس جلسہ کی صدارت قبول کی،

ہمارے آنریری سکرٹری **نواب صدر یار جنگ** بہادر خاص طور پر لائق شکر گذاری ہیں انھوں نے کانفرنس کی بڑی خدمت کی ہے اور اس کے لئے بہت تکلیف اٹھائی ہے،

میں کلکتہ کے مقامی کارکنوں کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا وہ سب فدائیوں کے طور پر کام کر رہے ہیں، ایسی صورت میں کسی کا نام لینا میں مناسب نہیں سمجھتا، اور بغیر اظہار نام سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اُن کا ممنون ہوں،

آنریبل حسین شہید سہروردی کے بعد خاکسار آنریری سکریٹری کانفرنس نے کانفرنس کے اجلاس سالانہ کے اختتام کا اعلان کرتے ہوئے کہا،

حضرات! اب رات بہت زیادہ گزر چکی ہے اس لئے میرے واسطے کسی طویل تقریر کا موقع باقی نہیں رہا، میں اُن حضرات کا شکرگزار ہوں جنھوں نے کانفرنس کے اجلاس کو کامیاب بنانے کی کوشش کی ہیں نواب کمال یار جنگ بہادر کا خصوصیت سے شکرگزار ہوں کہ وہ تکلیف گوارا کرکے حیدرآباد سے کلکتہ تشریف لائے،

آنریبل مولوی ابوالقاسم فضل الحق صاحب شکریہ سے بالاتر ہیں، انھوں نے ہمیں دعوت دی اور کلکتہ میں کانفرنس کے اجلاس کرنے کا موقع ملا، آنریبل حسین شہید سہروردی اور ان کے دوسرے رفیق بھی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں، اور میں اُن سب کا دل سے شکرگزار اور ممنون ہوں، میرے لئے شاید یہ مناسب نہ ہوگا کہ تفصیل کے ساتھ یہ عرض کروں کہ کس نے کیا کام کیا اور وہ کس حد تک لائق شکریہ ہے،

اس موقع پر یہ عرض کرنا بے موقع نہ ہوگا کہ ہم سب کو اس کا دلی افسوس وصدمہ ہے کہ ٹرکی پر زلزلہ کی وجہ سے ایسی مصیبت آئی جس سے سلطنت کا نظام متزلزل ہوگیا اس جلسہ کی یہ بہت بڑی سعادت ہے کہ سب سے پہلے ٹرکی سلطنت کی مالی امداد کا آغاز اس جلسہ سے ہوا، میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دوسروں کو بھی اس نظیر کی تقلید کی توفیق عطا فرمائے، اور وہ پوری قوت سے ٹرکی کے مصیبت زدہ لوگوں کی امداد کریں،

اس جلسہ میں مجمع کی جو کثرت رہی اور جو مظاہرے ہوئے اور جس دلچسپی سے لوگ جلسوں میں شریک ہوئے یہ سب چیزیں ہمارے لئے لائق اطمینان ہیں، امید ہے کہ اجلاس کے بعد لوگ اُن تجاویز پر عمل کرنے کی کوشش کریں گے جو یہاں منظور ہوئی ہیں،

اب میں آپ سب حضرات سے رخصت ہوتا ہوں اور یہ اعلان کرتا ہوں کہ کانفرنس کا یہ اجلاس ختم ہوا،

اس اعلان کے بعد ۱۲ بجے شب کو کانفرنس کا سالانہ اجلاس ختم ہوا، اس کے بعد

مشاعرہ شروع ہوا جو ۳ بجے رات تک جاری رہا۔ اور تمام حاضرین اجلاس بڑی دلچسپی کے ساتھ آخر تک مشاعرہ میں شریک رہے، مشاعرہ کی صدارت بنگال کے مشہور شاعر خان بہادر رضا علی صاحب وحشت نے فرمائی، ابوالاثر حفیظ صاحب جالندھری کا کلام مشاعرہ میں بار بار سنا گیا پھر بھی حاضرین سیر نہ ہوئے،

اجلاس کی وجہ سے تین روز تک کلکتہ میں غیر معمولی ہلچل رہی اور تمام مسلمانوں نے غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا،

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں جو اصحاب شریک ہوئے اُن کی تعداد سینکڑوں سے گزر کر ہزاروں تک پہنچی ہو، ذیل میں مثالاً چند نام شائع کئے جاتے ہیں

(۱) آنریبل مولوی ابوالقاسم فضل حق صاحب وزیر اعظم بنگال (۲) آنریبل حسین شہید سہروردی وزیر بنگال جنرل سکرٹری استقبالیہ کمیٹی (۳) آنریبل عزیز الحق صاحب اسپیکر بنگال اسمبلی و وائس چانسلر کلکتہ یونیورسٹی (۴) نواب کمال یار جنگ بہادر (۵) آنریبل ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان صاحب جج فیڈرل کورٹ، وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (۶) نواب صدیار جنگ بہادر (۷) مولانا سید سلیمان صاحب ندوی (۸) مولوی سید طفیل احمد صاحب (علیگ) (۹) خان بہادر مرزا ابو جعفر صاحب انسپکٹر مدارس کلکتہ (۱۰) آنریبل سر سعد اللہ صاحب وزیر اعظم آسام (۱۱) خان بہادر خلیفہ اسد اللہ صاحب امپیریل لائبریری کلکتہ (۱۲) خانصاحب سید احمد رشید صاحب (۱۴) مسٹر ابو المظفر احمد صاحب ٹریژرر ڈھاکہ یونیورسٹی (۱۵) مسٹر عظمت الٰہی زبیری رجسٹرار مسلم یونیورسٹی (۱۶) ڈاکٹر شہید اللہ صاحب ڈھاکہ یونیورسٹی (۱۷) پروفیسر محمد ہارون خاں صاحب شروانی (۱۸) ڈاکٹر بدل الرحمن صاحب پرنسپل اسمٰعیلیہ کالج (۱۹) ڈاکٹر محمد زبیر صاحب صدیقی کلکتہ یونیورسٹی (۲۰) پروفیسر عبدالقادر صاحب ایم اے پشاور کالج (۲۱) سیٹھ احمد ہارون جعفر صاحب پونا (۲۲) خان بہادر سید رضا علی صاحب وحشت (۲۳) مولوی محمد اکرم خاں صاحب ایڈیٹر آزاد (۲۴) حاجی مولوی محمد امین صاحب تاجر ورمیں (۲۵) خان بہادر فضل قدیر صاحب ایم ایل اے (۲۶) خان بہادر شمس الدین احمد صاحب (۲۷) مولوی حاجی محمد مقتدیٰ خاں صاحب شیروانی (۲۸) مولوی محمد عباس خاں صاحب شروانی (۲۹) عبدالجبار صاحب وحیدی ایڈیٹر عصر جدید کلکتہ (۳۰) شفاء الملک حکیم نثار احمد خاں صاحب (۳۱) خان بہادر عبدالمومن صاحب ڈپٹی کمشنر بنگال (۳۲) مسٹر ایم اے ایچ اصفہانی ایم ایل اے (۳۳) مسٹر اے آر صدیقی ایم ایل اے (۳۴) خان بہادر بدر الدین احمد صاحب (۳۵) الحاج چودھری محمد اسمٰعیل خاں ایم ایل اے (۳۶) خان بہادر ولی الاسلام صاحب چیف پریسیڈنسی مجسٹریٹ (۳۷) خان بہادر محمد موسیٰ صاحب پرنسپل کلکتہ مدرسہ (۳۸) مسٹر محمد عالم صاحب اسسٹنٹ ڈائرکٹر تعلیمات پشاور (۳۹) حاجی عبدالرزاق عبدالستار صاحب ممبر کونسل آف اسٹیٹ (۴۰) مسٹر عبدالرحمن صدیقی صاحب (۴۱) بیگم صاحبہ نواب کمال یار جنگ بہادر (۴۲) بیگم صاحبہ آنریبل فضل حق (۴۳) بیگم صاحبہ سید احمد رشید (۴۴) مس قمر جہاں بیگم صاحبہ (۴۵) مسز حکیم صاحبہ (۴۶) مس ذکیہ سلطان صاحبہ ایم اے (۴۷) مسز احسن (۴۸) مسز شریف کے ملک (۴۹) مسز بدرالدین وغیرہ۔

خواتین کے لئے پنڈال کے ایک حصہ میں پردہ کے ساتھ نشست کا خاص انتظام کیا گیا تھا

رپورٹ آنریری سکریٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

بابت سنہ ۳۹-۱۹۳۸ء

حضرات! نہایت مسرت کا مقام ہے کہ آج تیسری دفعہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس بنگال کے دار الحکومت کلکتہ میں منعقد ہو رہا ہے، یہ کانفرنس سنہ ۱۸۸۶ء سے قائم ہے، اس کے ابتدائی بارہ اجلاس صوبجات متحدہ اور پنجاب کے مختلف اضلاع میں منعقد ہوئے، اس کے بعد سنہ ۱۸۹۹ء میں نواب محسن الملک مرحوم کے زمانہ میں کانفرنس کا تیرہواں سالانہ اجلاس پہلی دفعہ کلکتہ میں منعقد ہوا جو اس زمانہ میں سارے ہندوستان کا دار الحکومت تھا، اس اجلاس کے صدر آنریبل جسٹس سید امیر علی صاحب مرحوم تھے جو اپنے عہد میں ایک ممتاز شخصیت رکھتے تھے، اس زمانہ میں کانفرنس کا نام "محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس" تھا، یہ اجلاس بہت کامیاب رہا، اور اس میں ہندوستان کے بہت سے مسلمان مشاہیر اور تعلیم یافتہ اصحاب کے علاوہ اس زمانہ کے لفٹنٹ گورنر بنگال سر جان لوڈبرن نے بھی شرکت فرمائی،

اس کے بعد دوسری دفعہ سنہ ۱۹۱۷ء میں کانفرنس کا اکتیسواں اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا اس اجلاس کے صدر سر اکبر حیدری بالقابہ (حال صدر المہام دولت آصفیہ) تھے، اسی سال صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب مرحوم جو متواتر دس سال سے کانفرنس کی مخلصانہ و بے غرضانہ خدمت نہایت انہماک سے انجام دے رہے تھے، کانفرنس کی خدمات سے سبکدوش ہو کر انڈیا کونسل کی ممبری پر انگلستان جا چکے تھے، اور یہ خدمت میرے سپرد کی گئی تھی اس لئے مجھے کلکتہ حاضر ہونے اور اجلاس کے سلسلہ میں تھوڑی بہت خدمت کرنے کا شرف حاصل ہوا،

سنہ ۱۹۱۷ء کے بعد کانفرنس کے سالانہ اجلاس ہندوستان کے مختلف اضلاع میں منعقد ہوتے رہے یہاں تک کہ اب خوش قسمتی سے کانفرنس کو تیسری دفعہ کلکتہ میں اپنا سالانہ اجلاس کرنے کا موقع حاصل ہوا

گزشتہ سال کانفرنس کا اجلاس آپ کے ہمسایہ صوبہ یعنی بہار کے دار الحکومت پٹنہ

میں منعقد ہوا تھا، حسن اتفاق سے اس اجلاس کے صدر آپ کے صوبہ کے نامور باہمت وزیر اعظم آنریبل مولوی ابوالقاسم فضل الحق صاحب تھے جن کی ذات صوبہ بنگال بلکہ ہندوستان میں بھی محتاج تعارف نہیں، اس موقع پر آنریبل ممدوح نے کانفرنس کے بعض بہی خواہوں کی تحریک پر ۱۹۳۹ء کے لئے کانفرنس کو کلکتہ میں مدعو کرنا منظور فرمایا اور کانفرنس کے اجلاس عام میں اس کا اعلان بھی فرمادیا جو نہایت مسرت سے سنا گیا۔ اس اعلان میں اجلاس کے لئے کسی خاص مہینہ کا تعین نہیں کیا گیا تھا بلکہ اس کا فیصلہ کانفرنس کی مجلس انتظامی پر چھوڑ دیا گیا تھا۔

اجلاس پٹنہ کے بعد بعض ایسے موانع پیش آئے کہ یہ اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ شاید ۱۹۳۹ء میں کانفرنس کا اجلاس کلکتہ میں نہ ہوسکے، لیکن آنریبل مولوی ابوالقاسم فضل الحق صاحب اور اُن کے رفقاء نے عزم وہمت سے کام لے کر ان دشواریوں کو دور کیا اور ایک باضابطہ مجلس استقبالیہ قائم کرکے اجلاس کا کام پوری سرگرمی سے شروع کردیا، یہ اسی سعی وکوشش کا نتیجہ ہے کہ آج کلکتہ میں کانفرنس کا اجلاس غیر معمولی شان وشوکت سے منعقد ہورہا ہے،

حضرات! کانفرنس نے گزشتہ نصف صدی سے زیادہ مدت میں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کیلئے مسلسل جو جد وجہد کی ہے باخبر اصحاب اس سے بخوبی واقف ہیں، ابتدا میں مسلمانوں کی صرف یہی ایک انجمن تھی جس نے اپنے دائرہ عمل کو سارے ہندوستان میں وسعت دی، اور مسلمانوں کو جدید انداز پر کام کرنے کا طریقہ سکھایا، ورنہ کانفرنس سے پہلے مسلمانوں کا کوئی ایسا قومی پلیٹ فارم نہ تھا جہاں ہندوستان کے ہر صوبہ کے مختلف الخیال مسلمان جمع ہوکر مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے ذرائع اور دوسرے قومی مسائل پر بحث وگفتگو کرسکیں،

اگرچہ موجودہ رواج کے مطابق ابتدا میں کانفرنس کے نام کے ساتھ "آل انڈیا" نہیں لکھا جاتا تھا لیکن عملی طور پر اس کی حیثیت ہمیشہ سے ایک آل انڈیا ادارہ کی تھی اس لئے ہر صوبہ کے مسلمانوں کو اس میں شریک ہونے اور زیر بحث تعلیمی مسائل میں حصہ لینے کا حق حاصل تھا، اور اسی حیثیت کی بنا پر اس کے اجلاس ہندوستان کے مختلف صوبوں میں منعقد ہوتے رہے، چنانچہ گذشتہ صدی میں کلکتہ میں پہلی دفعہ کانفرنس کا جو سالانہ اجلاس زیر صدارت جسٹس سید امیر علی منعقد ہوا وہ بھی کانفرنس کی اس حیثیت کو بخوبی ظاہر کرتا ہے،

سرسید نے ہندوستان کے مسلمانوں کو پسماندگی کی حالت میں پایا، اس لئے یہ چاہا کہ وہ بھی دوسری قوموں کی طرح ترقی کریں، جس کی تدبیر اُن کے خیال میں یہ تھی کہ مسلمان جدید مغربی تعلیم حاصل کرکے ترقی کے موجودہ وسائل و ذرائع سے فائدہ اٹھائیں، لہذا سرسید نے اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے دو اہم اداروں کی بنیاد رکھی، ایک ایم اے او کالج جو اب ترقی کرکے مسلم یونیورسٹی بن گیا ہے۔ دوسرا ادارہ یہ کانفرنس ہے جو اس تعلیم گاہ کا سنگ بنیاد رکھنے کے دس سال بعد ۱۸۸۶ء میں قائم کیا گیا، کانفرنس کا پہلا اجلاس علی گڑھ میں ہوا، لیکن اس کے بعد بتدریج اس کا دائرہ عمل اور حلقۂ اثر وسیع ہوتا گیا یہاں تک کہ نواب محسن الملک مرحوم کے زمانہ میں کانفرنس نے بہت ترقی کی اور ملک میں ایک خاص اہمیت و مرکزیت حاصل کرلی، اس کے بعد صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب مرحوم نے نہایت سرگرمی سے کانفرنس کی مخلصانہ خدمت انجام دے کر اس کی آواز ہندوستان کے ایک ایک گوشہ تک پہنچا دی،

غرض کانفرنس نے گزشتہ پچاس سال میں اپنے سالانہ اجلاسوں کے ذریعہ سے ہر صوبہ کے مسلمانوں میں ایک عام بیداری پیدا کردی اور وہ تعلیم حاصل کرنے کی طرف متوجہ ہوگئے، چنانچہ کانفرنس کی تحریک سے جابجا مکاتب اور اسکول قائم ہوئے تعلیمی انجمنیں اور لوکل کمیٹیاں وجود میں آئیں، ہر صوبہ کے مسلمانوں کی تعلیمی مشکلات پر غور کیا گیا، اور ماہرین فن کے مشورہ سے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے مختلف تجاویز منظور ہوئیں اور مسلمانوں کے لیے تعلیمی سہولتیں بہم پہنچانے کے لئے بہت سے مطالبات حکومت سے کئے گئے، اور اسی سلسلہ میں صوبہ کے ذمہ دار حکام اور اعلیٰ افسروں کے پاس میموریل اور ڈپوٹیشن بھیجے گئے،

نیز کانفرنس نے اپنے مفید لٹریچر یعنی مضامین، مقالات، رسائل و اخبارات کے ذریعہ سے لوگوں کو تعلیم کی ترغیب دی اور اس سلسلہ میں ایک نہایت وسیع لٹریچر ملک کے سامنے پیش کیا، کانفرنس کی لٹریری خدمات کے سلسلہ میں اُس کے سالانہ اجلاسوں کے خطبات صدارت کو بھی ایک خاص درجہ اور اہمیت حاصل ہے یہ خطبات عموماً ایسے ماہرین فن اور مشاہیر ملک کے ہیں جن کی رائے اور خیالات مسئلہ تعلیم کے متعلق ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں، اور تعلیم کا کوئی ایسا پہلو نہیں ہے جو اس مجموعہ خطبات میں نظرانداز کردیا گیا ہو۔ کانفرنس نے ان خطبات کا مجموعہ علیحدہ بھی کتاب کی صورت میں شائع کردیا ہے،

غرض کانفرنس مسلمانوں کی اصلاح اور تعلیمی ترقی کے لئے مختلف طریقوں سے کوشش کر رہی ہے جن میں سے ایک طریقہ یہ سالانہ اجلاس بھی ہے جس کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمان ماہرین تعلیم اور قومی و تعلیمی کام کرنے والوں کو ایک جگہ جمع ہونے اور مسلمانوں کی اصلاح اور تعلیمی ترقی کے وسائل پر غور و بحث کرنے کا موقع ملتا ہے، خصوصاً جس صوبہ میں یہ اجلاس منعقد ہوتا ہے وہاں کے مسلمانوں کی صحیح تعلیمی حالت اور مشکلات سے پوری واقفیت حاصل ہو جاتی ہے، کیونکہ اس صوبہ کے عام مسلمان اور باخبر اصحاب اجلاس میں شریک ہو کر اپنے صوبہ کے مسلمانوں کی تعلیمی مشکلات اجلاس میں پیش کرتے ہیں جن کی بنیاد پر تجاویز مرتب کر کے اجلاس میں منظور کی جاتی ہیں اور حکومت سے ان مشکلات کے دور کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے،

یہ طریقہ کانفرنس میں ابتداء سے جاری ہے، ہر سال جو تجاویز منظور ہوتی ہیں، ان کے متعلق دفتر جو کارروائی کرتا ہے وہ عام اطلاع کے لئے دوسرے سال کے اجلاس میں پیش کی جاتی اور سالانہ رپورٹ میں شائع کی جاتی ہے،

اس کے علاوہ یہ سب تجاویز اخبارات میں شائع کی جاتی ہیں تاکہ مسلمان عام طور پر اس سے واقف ہو جائیں کہ ان کی تعلیمی ضروریات کیا ہیں، اور کانفرنس ان کے پورا کرنے کے لئے جو کوشش کر رہی ہے اس کی تائید کس قدر ضروری ہے،

بہت سی تجاویز ایسی بھی ہوتی ہیں جن پر عمل کرنا خود مسلمانوں کا کام ہے، اور ان کی تکمیل حکومت کی امداد پر موقوف نہیں، لہذا ان پر عمل کرنے کے لئے صرف مسلمانوں کو توجہ دلائی جاتی ہے،

حسب دستور گزشتہ سال اجلاس پٹنہ میں بہت سی مفید و ضروری تجاویز منظور ہوئیں جو حکومت کو بھیجی گئیں اور مسلمانوں کو ان پر توجہ دلائی گئی ان کی مفصل کیفیت ذیل میں پیش کی جاتی ہے،

گزشتہ سال کی تجاویز

کانفرنس کے اجلاس پٹنہ منعقدہ یکم لغایت ۳ - اکتوبر ۱۹۳۸ء میں ۲۷ رزولیوشن پاس ہوئے تھے ان میں سے چھ نواب بہادر ڈاکٹر سر محمد مزمل خاں، علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال، ڈاکٹر سر راس مسعود، آنریبل نواب سر عبد القیوم، نواب سی عبد الحکیم مدراس، خان بہادر مولوی مصباح العثمان بلند شہر، خان بہادر مولوی فصیح الدین بدایوں، مولوی حمید حسن مدراس، اور مولوی محمد بشیر مرزا مرحوم مغفور کی تعزیت کے تھے جن کو مرحومین کے ورثار کے پاس بھیجا گیا۔ دو رزولیوشن اعلیٰ حضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ اور حضور ہز ہائی نس نواب صاحب جونا گڈھ کے شکریہ کے تھے۔ اول الذکر میں اعلیٰ حضرت کی اس مہربانی کا شکریہ ادا کیا گیا تھا کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے نمائندوں نے کانفرنس میں شرکت فرمائی عالیمرتبت ہز ہائی نس نواب صاحب جونا گڈھ کا شکریہ مبلغ پانچ ہزار روپئے کے اس عطیہ کے بارے میں تھا جو حضور ممدوح نے کانفرنس کو مرحمت فرمایا تھا۔

ایک اور تجویز کے ذریعہ کلکتہ، ڈھاکہ، علی گڑھ اور پٹنہ کی یونیورسٹیوں کا اپنے اپنے نمائندے بھیجنے کے لئے شکریہ ادا کیا گیا تھا۔ شکریہ کے یہ رزولیوشن حیدرآباد، جونا گڈھ اور مذکورہ بالا یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر صاحبان کی خدمت میں بھیجے گئے۔

پٹنہ کانفرنس کا سب سے اہم رزولیوشن "وار دھا تعلیمی اسکیم" کے بارے میں تھا جس کے الفاظ حسب ذیل تھے۔

"یہ کانفرنس وار دھا تعلیمی اسکیم کو اس کی موجودہ صورت میں مسترد کرتی ہے اور اپنے سابقہ رزولیوشن کا اعادہ کرتے ہوئے تجویز کرتی ہے کہ تمام ملک میں لازمی اور مفت تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ یہ تعلیم لڑکوں کے لئے کم از کم ۷ سال اور لڑکیوں کے لئے کم از کم ۴ سال کی یعنی ۷ سے ۱۴ اور ۷ سے ۱۱ سال کی عمر تک علی الترتیب ہونی چاہئے۔

اس کانفرنس کی رائے ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام جدا جدا ہونا چاہئے۔ تعلیم مادری زبان کے ذریعہ سے ہونی چاہئے یعنی شمالی ہند کے مسلمانوں کے لئے ذریعہ تعلیم اردو زبان ہو۔ جن صوبوں میں ہندوستانی زبان رائج نہیں ہے وہاں

صوبہ کی زبان ذریعہ تعلیم ہو لیکن ہر طالب علم کو ہندوستانی زبان بطور ثانوی زبان کے سکھائی جائے اور رسم الخط کے بارے میں اس بات کا پورا انتظام کیا جائے کہ مسلمان اس زبان کو اردو رسم الخط میں سیکھیں۔ ہندوستانی زبان سے مراد وہ زبان ہے جس کو شمالی ہند کے معمولی پڑھے لکھے ہندو اور مسلمان عام طور پر بولتے اور سمجھتے ہیں۔

تعلیم میں کسی مناسب حرفہ یا دستکاری کو مرکزی اہمیت دینی چاہئے اور جو دوسری تعلیم دی جائے اس کو بچہ کے معاشرتی و طبعی ماحول اور اس کے حرفہ سے مربوط و متوازن رکھنے کی حتی المقدور کوشش کرنی چاہئے۔

مسلمان بچوں کے لئے مذہبی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔

جو بچے ہائی اسکول اور کالج کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے مروجہ عام انگریزی تعلیم حاصل کرنی چاہیں اُن کی سہولت کے لئے گیارہ سال کی عمر کے بعد بنیادی اور ثانوی تعلیم میں مناسب ربط پیدا کیا جائے اور موجودہ سہولتیں علیٰ حالہٖ برقرار رکھی جائیں۔

(ب) اس کانفرنس کی رائے میں مسلمانوں کے کلچر کے تحفظ کے لئے یہ امر نہایت ضروری ہے کہ صوبہ متحدہ میں جو اسپشل اسکیم متعلق ابتدائی تعلیم مسلمان بچوں کے سنہ ۱۹۱۶ء یعنی لارڈ میسٹن کے زمانہ میں منظور ہوئی تھی اور اب تک جاری ہے اور جس نے مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم کو بہت نفع پہنچایا ہے وہ بدستور جاری رہے۔

(ج) جس طرح صوبہ بمبئی میں اردو کے مدارس کی اسکیم جاری ہے وہ علیٰ حالہٖ قائم رہنی چاہئے اور دوسرے صوبوں میں بھی جو اس قسم کے انتظامات موجود ہیں وہ بھی جاری رہیں۔

نا یح ضمن (الف) مندرجہ صدر جو تجاویز آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی سب کمیٹی نے بتاریخ ۲۔ اگست سنہ ۱۹۳۸ء صوبہ متحدہ کی ابتدائی تعلیم کے متعلق منظور کی ہیں ان کی یہ جلسہ تائید کرتا ہے۔"

اس رزولیوشن کی ملک کے انگریزی اور اردو اخبارات میں اشاعت کی گئی اور ۷ دسمبر سنہ ۱۹۳۸ء کو اس کی نقول مع خطوط سکرٹری سنٹرل بورڈ آف ایجوکیشن نئی دہلی سکرٹری نیشنل ایجوکیشن بورڈ وارد ھا آنریبل وزیر تعلیم دہلی اور آنریبل وزیر تعلیم صوبہ بمبئی (پونا) کو بھیجی گئیں۔

صوبہ بمبئی کے وزیر اعظم کی جانب سے جو صوبہ مذکور کے وزیر تعلیم بھی تھے ۱۷ ستمبر ۱۹۳۸ء کو جواب موصول ہوا کہ ہم آپ کے رزولیوشن پر پوری توجہ کریں گے۔

۴ جنوری ۱۹۳۹ء کو مسٹر اے۔ سلام اسکوائر ایم۔ اے سکرٹری سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کا جواب ملا کہ اس بورڈ کی مقرر کردہ ایک سب کمیٹی نے واردھا اسکیم پر اچھی طرح غور کیا تھا اور کمیٹی مذکور نے اپنی رپورٹ ۳ دسمبر ۱۹۳۸ء کو بورڈ کے سامنے پیش کی اور جب نے رپورٹ کی سفارشات کو عام طور پر پسند کر کے طے کیا کہ اُن کی نقول مختلف صوبوں کی گورنمنٹوں کو غور کرنے کی غرض سے بھیج دی جائیں۔ رپورٹ کی ایک کاپی آپ کی اطلاع کے واسطے بھی ملفوف ہے۔ چونکہ یہ رپورٹ عام طور پر اخبارات میں شائع ہو چکی ہے اس لئے اُس کو یہاں نظر انداز کیا جاتا ہے۔

۴ دسمبر ۱۹۳۸ء کو دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے واردھا اسکیم پر غور کرنے کے لئے جناب راجہ صاحب پیرپور کی صدارت میں ایک کمیٹی کا تقرر کیا اور کمیٹی مذکور نے اپنے کام میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے کارکنوں سے اتحاد عمل کیا چنانچہ اس کے تمام جلسے علی گڑھ میں ہوئے اور وہیں رپورٹ تیار ہوئی کانفرنس کے نمائندگان پروفیسر عبد المجید صاحب قریشی ایم، اے آنریری جوائنٹ سکرٹری کانفرنس۔ پروفیسر حبیب الرحمٰن صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج علی گڑھ و سکرٹری شعبہ تعلیمی کانفرنس اور سید الطاف علی بی اے ہیڈ اسسٹنٹ دفتر کانفرنس جن کو لیگ کمیٹی نے بطور ممبر کو اپٹ کر لیا تھا پورے طور پر شریک کار رہے۔ کمیٹی کی رپورٹ جو "پیرپور کمیٹی" کے نام سے موسوم ہے جب انگریزی اور اردو میں شائع ہو چکی تو نوابزادہ لیاقت علی خاں صاحب جنرل سکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ حسب خواہش کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی نے بھی اپنے جلسہ منعقدہ ۔۔ ۳ مئی ۱۹۳۹ء میں پیرپور کمیٹی رپورٹ پر غور کیا اور کانفرنس کی جانب سے تفصیلی اظہار رائے کے لئے ایک سب کمیٹی جس کے پروفیسر عبد المجید قریشی کنوینر اور پروفیسر حبیب الرحمٰن صاحب، پروفیسر آل احمد صاحب سرور اور سید الطاف علی صاحب بی اے رکن تھے مقرر کی۔ اس سب کمیٹی کے دو جلسے ہوئے لیکن قبل اس کے کہ رپورٹ تیار ہو کر صدر دفتر آل انڈیا مسلم لیگ کو بھیجی جاتی لیگ ورکنگ کمیٹی کا جلسہ بمبئی میں ہوا اور اس نے پیرپور کمیٹی کی رپورٹ کو منظور کر کے تمام صوبہ مسلم لیگوں کو ہدایت کر دی کہ وہ واردھا اسکیم

پر اپنے اپنے اعتراضات اور جملہ تعلیمی شکایات بصورت عرضداشت مرتب کرکے اپنے اپنے صوبہ کے گورنروں اور وزرائے اعظم کے پاس بھیجیں۔ اس فیصلہ کے بعد آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو پھر پوری رپورٹ پر مزید اظہار رائے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

واردھا اسکیم کے سلسلہ میں اصلی کام مختلف صوبوں میں تھا جہاں کانگریسی وزارتوں نے اسکیم مذکور کو رواج دینے کی غرض سے "جدید تنظیم تعلیم" کی کمیٹیوں کا تقرر کر رکھا تھا اور اُن کی رپورٹیں شائع ہوکر اُن پر عمل درآمد کیا جانے والا تھا میں اپنی سالگذشتہ کی رپورٹ میں بتا چکا ہوں کہ مختلف صوبوں کی گورنمنٹوں بالخصوص یوپی گورنمنٹ نے جدید تنظیم تعلیم کی کمیٹیوں میں صحیح کام کرنے والے مسلم ماہرین تعلیم کو کس طرح نظر انداز کیا اور مسلمانوں کے واجبی مطالبات و شکایات کو سُننے سے کس ناگوار طریقہ پر گریز کیا۔ تاہم بایں کن حالات کے باوجود کانفرنس نے اپنی کوششوں کو جاری رکھا اور طریقہ کار یہ اختیار کیا کہ چونکہ تمام کانگریسی صوبوں میں تعلیمی اسکیمیں قریب قریب ایک ہی اصول کے ماتحت چلائی جا رہی تھیں صرف تفصیلات میں اختلاف تھا اس لئے کسی ایک صوبہ کے مسلمانوں کے مسئلہ تعلیم کو پوری قوت کے ساتھ ہاتھ میں لیا جائے تاکہ ایک جگہ کی جدوجہد دوسرے صوبوں کے لئے بطور نمونہ کے کام دے سکے۔

اس لائحہ عمل کے ماتحت کانفرنس نے ۹ و ۱۰۔ اپریل ۱۹۳۹ء کو اپنے ہیڈ آفس سلطان جہاں منزل علی گڑھ کے ہال میں پراونشل مسلم ایجوکیشنل یوپی کا پندرھواں سالانہ اجلاس مدعو کیا جس کے صدر نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب ایم اے آکسن بار ایٹ لا جنرل سکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ تھے۔ صوبہ یوپی کے مشہور ماہرین تعلیم کا یہ ایک بہت اچھا اجتماع تھا اور دو روز کے مسلسل بحث و مباحثہ اور غور و فکر کے بعد متعدد و مفید و عملی کام کے رزولیوشن منظور ہوئے۔ سب سے اہم رزولیوشن ایک کمیٹی کے بارے میں تھا جس کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی تنظیمی کمیٹی رپورٹ پر جس وقت وہ شائع ہو فوراً مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے غور کرکے مسلمانوں کی رہنمائی کرے۔ اس کمیٹی کا جلسہ ۷ اور ۸۔ اگست ۱۹۳۹ء کو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے دفتر میں منعقد ہوا اور بعدہٗ ۱۰۔ دسمبر کو اس کا دوسرا جلسہ ہوا۔ کمیٹی کے حسب ذیل ممبران نے بحث و مباحثہ میں حصہ لیا۔

(۱) نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب ———— صدر

(۲) خان بہادر مولوی محمد عبید الرحمٰن خاں صاحب شروانی ایم، ایل، اے ٹرسٹی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

(۳) پروفیسر اے، بی، اے حلیم بی، اے آکسن بار ایٹ لا۔ پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

(۴) پروفیسر عبد المجید صاحب قریشی ایم اے چیرمین شعبۂ ریاضی۔ پرووسٹ سرسید ہال مسلم یونیورسٹی علی گڑھ و آنریری جوائنٹ سکرٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس۔

(۵) مولانا سید طفیل احمد صاحب سابق ایم، ایل، سی منیجر مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول۔

(۶) خان بہادر مولوی محمد بشیر الدین صاحب ایڈیٹر البشیر، منیجر اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ و آنریری سکرٹری یوپی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس بدایوں۔

(۷) پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی ایم اے چیرمین اردو ڈپارٹمنٹ مسلم یونیورسٹی۔

(۸) ڈاکٹر افضال حسین قادری ایم، ایس، سی، پی، ایچ، ڈی (علیگ) پی، ایچ، ڈی (کینٹب)

(۹) مسٹر سید الطاف علی بریلوی بی، اے (علیگ) ہیڈ اسسٹنٹ دفتر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ۔

(۱۰) مولوی ارشاد علی خاں صاحب ہیڈ ماسٹر فیض عام ہائی اسکول میرٹھ۔

(۱۱) مولوی محمد یحییٰ صاحب ایم، اے، ایل، ایل، بی ایڈوکیٹ بدایوں۔

(۱۲) مولوی نظام الدین حسین صاحب نظامی ایڈیٹر ذوالقرنین و جوائنٹ سکرٹری یوپی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس۔

(۱۳) خان بہادر سید آل علی صاحب نقوی ایم، اے انسپکٹر مدارس اسلامیہ صوبہ متحدہ۔

کمیٹی کے مباحث کی رپورٹ "موسومہ دی ایجوکیشن آف مسلمس ان یوپی" جس کو مولوی سید الطاف علی صاحب ہیڈ اسسٹنٹ دفتر کانفرنس نے مرتب کیا تھا اردو اور انگریزی میں کثیر تعداد میں ملک کے طول و عرض میں شائع ہو چکی ہے۔ اس رپورٹ کے حصہ اول میں اُن شکایات اور بے اعتنائیوں کی تفصیل درج کی گئی ہے جو مسلمانوں کو کانگرسی گورنمنٹ کی جانب سے پیش آئیں اور حصہ دوم میں واردھا اسکیم کے بنیادی اصولوں سے متعلق ایک عام بحث کے بعد تعلیم نسواں، فرقہ وارانہ اداروں، نصاب، اساتذہ، ٹریننگ، تعلیم کی نگرانی، تہوار اور غیر درسی مشاغل نیز امدادی مدارس اور گرانٹ ان ایڈ وغیرہ کے عنوانوں

کے ماتحت سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور مدلل و مسکت دلائل و براہین سے ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں کی منشا اور نقطۂ نظر کیا تھا۔

خدا کا شکر ہے کہ کانفرنس کی یہ کوشش اس حد تک بار آور ہوئی کہ ایک طرف تو تمام مخالف و موافق انگریزی اردو پریس نے کانفرنس کی تیار کردہ رپورٹ کا بہت اچھا خیر مقدم کیا اور دوسری طرف مسلمانوں کو عام طور پر یہ معلوم ہو گیا کہ تعلیمی امور میں آئندہ اُن کا کیا طریقہ کار ہونا چاہیئے۔

واردھا اسکیم پر کانفرنس نے جو اظہار رائے کیا تھا اُس پر ۲۶۔جون ۱۹۳۹ء کا لکھا ہوا ایک مراسلہ مسٹر جان سارجنٹ اسکوائر ایم، اے ایجوکیشنل کمشنر گورنمنٹ آف انڈیا کا بھی موصول ہوا جس میں موصوف نے تحریر فرمایا کہ سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کے حال میں منعقد شدہ جلسہ میں آپ کے بھیجے ہوئے تمام رزولیوشنوں پر غور ہوا اور کمیٹی یہ معلوم کرکے اظہار طمانیت کرتی ہے کہ تمام خاص خاص مسائل تعلیمی پر کانفرنس اور بورڈ کے فیصلوں میں بہت کچھ متفق الخیالی ہے۔

پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی متذکرہ بالا تعلیمی رپورٹ کے شائع ہونے پر ایک خط ڈاکٹر محمود اللہ جنگ پارلیمنٹری سکرٹری جناب پرائم منسٹر صاحب صوبہ متحدہ کا موصول ہوا جس میں رپورٹ کی رسید و شکریہ کے علاوہ یہ لکھا تھا کہ آپ اپنے مطالبات پیش کیجئے ہر ممکن مدد کی جائے گی۔ اس کا جواب لکھا گیا کہ مطالبات رپورٹ میں درج ہیں۔

اس قدر کارروائی کے بعد یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو یورپ میں جنگ چھڑ گئی اور کانگرسی وزارتیں مستعفی ہو گئیں۔

اٹاوہ کانفرنس واردھا اسکیم کے ماتحت ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی تنظیم جدید کی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے یوپی گورنمنٹ نے ۲۲ جولائی ۱۹۳۹ء کے گزٹ میں ایک کمیٹی کو نامزد کیا جس کا کام یہ تھا کہ وہ صوبہ کے تمام امدادی اسکولوں کا ایک کانسٹی ٹیوشن تیار کرے اور "گرانٹ ان ایڈ" کے قواعد جب ضروری تو انہیں تجویز کرے۔ کمیٹی مذکور کے گیارہ ارکان میں صرف ایک مسلمان بیگم شاہد حسین صاحبہ ایم، ایل، اے (مراد آباد) کو لیا گیا اور دوسرے مسلم ماہرین تعلیم کو نظر انداز کر دیا گیا۔ ۲۶ جولائی ۱۹۳۹ء کو مولوی نظام الدین حسین صاحب آنریری جوائنٹ سکرٹری پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے اور ۷ اگست ۱۹۳۹ء کو خاکسار

آنریری سکرٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے آنریبل وزیر تعلیم کی خدمت میں احتجاجی خطوط و تار ارسال کئے لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی اور اگست ۱۹۳۹ء کے دوسرے ہفتہ میں کمیٹی نے اپنا کام ختم کر کے گورنمنٹ کو اپنی رپورٹ دے دی۔ اس رپورٹ کی سفارشات نے چونکہ تمام امدادی اسلامیہ اسکولوں کے وجود کو خطرہ میں ڈال دیا تھا اس لئے خان بہادر مولوی محمد بشیر الدین صاحب سکرٹری پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی دعوت پر ۸۔ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو بمقام آباد و صوبہ کے جملہ اسلامیہ اسکولوں کے ممبر صاحبان کی ایک کانفرنس زیر صدارت پروفیسر عبد المجید صاحب قریشی ایم اے آنریری جوائنٹ سکرٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقد ہوئی جس میں مولوی سید طفیل احمد صاحب اور سید الطاف علی بی اے ہیڈ اسسٹنٹ دفتر کانفرنس نے بھی بطور نمائندگان آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس شرکت کی۔ اس کانفرنس میں امدادی اسلامیہ اسکولوں کے تحفظ و بقا کی آٹھ تجاویز منظور ہوئیں اور ایک تجویز کے ذریعہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے زیر نگرانی ایک "اسلامیہ ایجوکیشن بورڈ" کا قیام عمل میں آیا جس کا یہ کام تجویز ہوا کہ وہ تمام اسلامیہ اسکولوں کی تنظیم اور ان کی حالت بہتر بنانے کی جدوجہد کرے۔

پٹنہ کانفرنس کے دو اور اہم رزولیوشن "ودیا مندر اسکیم" اور سی پی اسمبلی میں اردو کے استعمال کی ممانعت کے بارے میں تھے۔

ان رزولیوشنوں کی کانفرنس گزٹ، شمالی ہند کے انگریزی اردو اخبارات اور سی، پی کے اخبارات میں خصوصیت کے ساتھ اشاعت کی گئی اور ان کی نقول مع خطوط آنریبل اسپیکر صاحب سی، پی لیجسلیٹو اسمبلی، آنریبل وزیر تعلیم سی، پی گورنمنٹ، اور سکرٹری صاحب پراونشل مسلم لیگ ناگپور کی خدمت میں ۷ و ۹ نومبر ۱۹۳۸ء کو بھیجی گئیں۔ آخر الذکر سہ حضرات نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسی دوران میں سی، پی میں مسلمانوں نے "ودیا مندر اسکیم" کے خلاف سول نافرمانی شروع کر دی جس کے نتیجہ میں جناب نواب زادہ لیاقت علی خاں صاحب جنرل سکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ کی وساطت سے سی، پی گورنمنٹ سے ایک سمجھوتہ ہو گیا۔ خیال تھا کہ یہ سمجھوتہ مسلمانان سی، پی کے لئے قابل اطمینان ہوگا لیکن جب کچھ عرصہ کے بعد یہ معلوم ہوا کہ یہ کوشش بے سود ثابت ہوئی تو کانفرنس گزٹ نے مسلسل دو اشاعتوں میں مسلمانان سی، پی کے مطالبات اور ودیا مندر اسکیم کے سلسلہ میں مضامین لکھے گئے اور

۱۹۳۹ء

ان کی کاپیاں صوبہ کی ذی اثر قومی جماعتوں اور سربرآوردہ اصحاب کو بھیجی گئیں ۲۷ ستمبر کو ایک مفصل خط خان بہادر مرزا رحمن بیگ صاحب ایم' یل' اے ناگپور کو لکھا گیا جس میں موصوف سے درخواست کی گئی تھی کہ

"ازراہ کرم جلد از جلد ودیا مندر اسکیم کے متعلق آپ جس قدر مواد فراہم فرما کر ارسال کر سکتے ہیں بھیجدیں تاکہ جس طرح یو' پی کی تعلیم کے متعلق کانفرنس نے مفید موثر لٹریچر تیار کیا ہے اسی طرح سی' پی کے مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں ایک رسالہ تیار کیا جائے نیز یہ اطلاع دی گئی کہ مسلمانان سی' پی کی تعلیمی مشکلات کے حل میں آپ جو بھی خدمت کانفرنس سے لینا چاہیں اس کو بخوشی انجام دیا جائے گا۔"

خان بہادر صاحب نے مندرجہ بالا خط کا جواب نہیں دیا تو ۲- اکتوبر ۱۹۳۹ء کو خان بہادر حافظ ولایت اللہ صاحب کو جو سی' پی میں کانفرنس سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کے ایک ذی اثر رکن ہیں ایک خط لکھا گیا جس میں موصوف سے درخواست کی گئی کہ "جس طرح یو' پی کی تعلیمی اسکیم کے بارے میں کانفرنس نے سخت جد و جہد کی ہے اسی طرح سی پی کی ودیا مندر اسکیم کے متعلق کام کرنے کا قصد ہے لہذا نہ صرف یہ کہ آپ تمام ضروری لٹریچر بھجوا دیں بلکہ سی' پی میں پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے قائم کرنے میں بھی امداد دیں تاکہ اس کے ذریعہ کام میں سہولت ہو۔"

حافظ صاحب نے اس خصوص میں کافی توجہ فرمائی اور موصوف سے خط و کتابت کا ہنوز سلسلہ جاری ہے۔ آپ کا آخری خط ۴ دسمبر ۱۹۳۹ء کو موصول ہوا۔

دو رزولیوشن صوبۂ بنگال سے متعلق تھے ان میں سے ایک یہ تھا کہ اردو کی ترقی کے ذرائع مہیا کئے جائیں اور اس خصوص میں عملی قدم اس طرح اٹھایا جائے کہ ڈھاکہ میں اور دوسرے خاص خاص شہروں میں اردو کی اشاعت و ترویج کے لئے مرکز قائم کئے جائیں دوسرے رزولیوشن میں وزارت تعلیمی بنگال کی اس کوشش کو بنظر استحسان دیکھا گیا تھا جو وہ کلکتہ میں ایک بڑا مسلم گرلس کالج قائم کرنے نیز مفت اور لازمی ابتدائی تعلیم کو عام رواج دینے کے لیے کر رہی ہے۔ کانفرنس نے گورنمنٹ بنگال سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنی مجوزہ اسکیموں پر جلد از جلد عمل درآمد کرے نیز ابتدائی تعلیم کے نصاب میں اردو (ہندوستانی) کا پڑھنا اسی طرح لازم قرار دے جس طرح گورنمنٹ مدراس نے ہندی (ہندوستانی) کا پڑھنا لازمی قرار دیا تھا۔

ان رزولیوشنوں کی نقول مع خطوط ۲۷۔ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو آنریبل وزیر تعلیم اور ڈائرکٹر صاحب سررشتہ تعلیم بنگال کلکتہ کی خدمت میں بھیجی گئیں۔

۷ر دسمبر ۱۹۳۸ء کو خان بہادر ایس' مُرشد اسسٹنٹ سکریٹری ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ گورنمنٹ بنگال نے جواب دیا کہ ان امور کی جانب گورنمنٹ بنگال خصوصی توجہ کر رہی ہے اس قابل اطمینان جواب کی بنا پر نیز اس بنا پر کہ کانفرنس کا آئندہ سالانہ اجلاس آنریبل مولوی ابوالقاسم فضل الحق صاحب وزیر اعظم و وزیر تعلیم بنگال کی دعوت پر کلکتہ ہی میں منعقد ہونے والا تھا اور اس موقع پر مسلمانان بنگال کا تمام و کمال تعلیمی مسئلہ پوری تفصیلات کے ساتھ معرض بحث میں آنے والا تھا اس لئے مندرجہ بالا تجاویز کے متعلق کوئی مزید کارروائی نہ کی گئی۔

"ایک رزولیوشن اُڑیسہ کے متعلق تھا جس میں اس صوبہ کی حکومت سے پُرزور مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ مسلمان بچوں کے لئے ابتدائی اور ثانوی تعلیم میں اردو کو ذریعۂ تعلیم بنائے حکومت مذکور کے اس رویہ پر اظہار نفرت کیا گیا تھا کہ اُڑیسہ کی ٹیکسٹ کمیٹی میں کسی مسلمان کو شریک نہیں کیا گیا۔"

اس رزولیوشن کی "کانفرنس گزٹ" اور ملک کے اردو انگریزی اخبارات میں اشاعت کی گئی اس کے علاوہ آنریبل وزیر تعلیم اُڑیسہ گورنمنٹ کی خدمت میں اس کی نقل مع خط بھیجی گئی۔ کوئی جواب نہیں آیا۔

کانفرنس کے اجلاس پٹنہ میں ۸ رزولیوشن خاص صوبہ بہار کے متعلق تھے جن میں سے ۴ کا براہ راست گورنمنٹ صوبہ سے تعلق تھا اور گورنمنٹ سے درخواست کی گئی تھی کہ "جن امدادی اور سرکاری اسکولوں میں مسلمان طلبہ کم از کم دس فی صدی ہوں اُن میں وہ مسلمان ٹرینڈ ٹیچروں کا تقرر کیا جائے۔

پٹنہ ٹریننگ اسکول اور کالج میں مسلمان طلبہ کے لئے ۲۵ فی صدی نشستیں مخصوص کی جائیں ٹیچرس ٹریننگ کے ان اداروں میں ۲۵ فی صدی وظائف مسلمان طلبہ کو دئے جائیں۔ دربھنگہ میڈیکل اسکول میں مسلمان طلبہ کو ۲۵ فی صدی نشستیں دی جائیں۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی درسی کتابوں میں زبان اور اُن کا مواد اسلامی کلچر' تاریخ اور زبان

کے ہم آہنگ ہو۔ ہندی ساہتیہ سمیلن کی طرح انجمن ترقی اردو کو مالی امداد دی جائے صوبہ کی مختلف تعلیمی کمیٹیوں اور ہندوستانی کمیٹی میں صوبہ کے مستند مسلمان ماہرین فن تعلیم اور ادیبوں کو جگہ دی جائے۔ مسلم ماہرین تعلیم کی ایک مستقل کمیٹی کا اس غرض سے تقرر عمل میں لایا جائے کہ وہ ہندوستانی کمیٹی کی پیش کردہ کتابوں کی زبان اور مضامین کو مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے جانچا کرے۔"

ان تجاویز کی صوبہ بہار کے اخبارات میں خصوصاً اور ملک کے دوسرے اخبارات میں عموماً اشاعت کی گئی نیز اُن کی نقول مع خط یکم نومبر ۱۹۳۸ء کو آنریبل وزیر تعلیم صوبہ بہار کی خدمت میں بھیجی گئیں۔

۲ جون ۱۹۳۹ء کو مسٹر ایل، جے لیوکس انگوائر آئی، سی، ایس ڈپٹی سکریٹری ایجوکیشن بہار نے مندرجہ بالا تمام تجاویز کے بارے میں حسب ذیل مفصل جواب دیا:-

بجواب خط نمبر ۱۵۴/۳۰۹۴ مورخہ یکم نومبر ۳۸ء موسومہ ڈائرکٹر صاحب سررشتہ تعلیم بہار جس کے ساتھ آپ نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس پٹنہ کے رزولیوشنوں کی نقول ارسال کی تھیں موصول ہوا۔ ہر ایک رزولیوشن کے بارے میں پراونشل گورنمنٹ کی رائے درج ذیل ہے۔

رزولیوشن نمبر ۲ (الف) جدید تنظیم تعلیم کی کمیٹی اور ہندوستانی کمیٹی میں آل انڈیا شہرت رکھنے والے مسلمان ممبر موجود ہیں۔ پروفیسر خواجہ غلام السیدین جو جدید تنظیم تعلیم کی کمیٹی کے ایک ممبر ہیں۔ ابھی حال میں ٹریننگ کالج علی گڑھ کے پرنسپل بھی تھے۔ مذکورہ کمیٹیاں اپنا کام کر رہی ہیں اور یہ تجویز قبل از وقت ہے کہ اُن میں بہار کے مسلم ماہرین تعلیم کا بھی تقرر کیا جائے۔

رزولیوشن نمبر ۲ (ب) ہندوستانی کمیٹی نے نہ تو ابھی تک اپنی رپورٹ دی ہے اور نہ کچھ کتابیں تیار ہوئی ہیں۔ کمیٹی مذکور کی جس طور پر تشکیل عمل میں آئی ہے وہ اس امر کی ضامن ہے کہ مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو نظر انداز نہ کیا جائے گا۔ ایک [illegible] کمیٹی کے قیام سے [illegible] البتہ جب کو ہندوستانی کمیٹی کی تیار کردہ کتابوں کو جانچنے کا اختیار حاصل ہو آخر الذکر کمیٹی کے سہولت کے ساتھ کام کرنے میں کوئی [illegible] نہیں دے گا اور اگر مسلم ماہرین کو ہندوستانی کمیٹی کے زیر نگرانی تیار شدہ کتابوں کے جانچنے کا حق [illegible] دیا جائے

تو دوسری مذہبی جماعتوں کے لوگ بھی لازمی طور پر یہی مطالبہ کریں گے اور اس طرح ہندوستانی کمیٹی بالکل بے اثر ہو جائے گی۔

رزولیوشن نمبر ۸۔ پرائمری اسکولوں کی درسی کتابوں کی بابت یہ ہے کہ گورنمنٹ ٹکسٹ بک کمیٹیوں کو یہ حکم ہے کہ وہ ڈائرکٹر کی خاص اجازت کے بغیر لوئر پرائمری کلاسوں کیلئے ادبی کتابوں کے علاوہ اپر پرائمری کلاسوں کی کوئی ہندی یا اردو کی کتاب تا وقتیکہ وہ ناگری اور اردو دونوں رسم الخط میں نہ چھاپی گئی ہو منظور نہ کی جائے۔ پرائمری اور سیکنڈری اسکولوں کی کتابوں میں اگر اسلامی یا غیر اسلامی پس منظر کا کوئی خاص لحاظ نہیں رکھا جاتا ہے تو ان کے لئے ایسے مضامین کا ضرور انتخاب کیا جاتا ہے جو ہندو اور مسلمان دونوں کیلئے مشترک ہوں اور ساتھ ہی ایک مشترکہ ہندوستانی کلچر پیدا کرنے میں ممد ہوں۔

اسکول کی درسی کتابوں کی زبان کی بابت گورنمنٹ کی پالیسی یہ ہے کہ لٹریچر کے مضامین کی کتابیں 'کامن لینگویج' میں لکھی جائیں۔ ۲۹ مارچ ۱۹۳۸ء کو ٹکسٹ بک کمیٹی نے طے کیا ہے کہ چونکہ بحالات موجودہ 'کامن لینگویج' کی ایسی کتابیں جو ہر قسم کے نقائص سے پاک ہوں ملنا دشوار ہیں اس لئے رائج الوقت کتابوں کو اس وقت تک خارج نہ کیا جائے جب تک کہ زیادہ بہتر کتابیں حاصل نہ ہو جائیں۔ گورنمنٹ نے اسکولوں کیلئے کتابیں تیار کرنے کی غرض سے ایک ہندوستانی کمیٹی کا بھی تقرر کیا ہے اور اس کی سفارشات کا انتظار ہے۔

رزولیوشن نمبر ۹۔ (الف) منسلکہ نقشے سے ظاہر ہوگا کہ کوئی گورنمنٹ ہائی اسکول یا سیکنڈری ٹریننگ اسکول ایسا نہیں ہے جس میں 'سبارڈینیٹ ایجوکیشنل سروس' کا کوئی مسلمان گریجویٹ ٹیچر اہل۔ ٹی موجود نہ ہو۔ بہت سے گورنمنٹ ہائی اسکولوں میں ایسے دو ٹیچر ہیں اور بعض میں تین تک ہیں اسی طرح تمام گورنمنٹ ہائی اسکولوں میں سبارڈینیٹ ایجوکیشنل سروس کے ایک ہیڈ مولوی کے علاوہ دو مولوی 'ورناکیولر ٹیچرس سروس' کے ہیں "سکنڈری ٹریننگ اسکولو سے ملحق پریکٹیسنگ اسکولوں" میں بھی مسلمان طلبہ کے مفاد کا مسلمان استادوں کی کافی تعداد کے تقرر کے ذریعہ تحفظ کیا جاتا ہے۔ تناسب آبادی کے لحاظ سے مولویوں کے علاوہ مسلمان ٹیچر گورنمنٹ ہائی اسکولوں میں کافی تعداد میں بلکہ بعض صورتوں میں زیادہ تعداد میں ملازم ہیں" 'ایڈیڈ' اسکولوں میں مسلمان ٹیچروں کے تقرر کا کوئی مقررہ تناسب نہیں ہے۔ امدادی

یا غیر امدادی ہائی اسکولوں میں ٹیچروں کے تقرر کا اختیار انسپکٹر آف سکول کی منظوری سے مینیجنگ کمیٹیوں کو ہے۔ تاوقتیکہ متعین مثالوں کے ذریعہ یہ نہ دکھایا جائے کہ مسلم طلباء کے مفاد کو واقعی نقصان پہنچا ہے۔ استادوں کا تناسب مقرر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ علاوہ بریں چند جگہوں کو چھوڑ کر مسلم استادوں کی تعداد یا جو روپیہ ان پر خرچ کیا جاتا ہے۔ اس کی مقدار عام طور پر مسلم طلباء کے تناسب تعداد یا جو روپیہ وہ فیس میں دیتے ہیں اس کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔

(۲) ملفوف ہذا بیان سے ظاہر ہوگا کہ پٹنہ ٹریننگ کالج کے ڈپلوما ان ایجوکیشنل کلاس میں مسلمانوں کا اوسط فیصدی ۳۷-۱۹۳۶ء ۳۸-۱۹۳۷ء اور ۳۹-۱۹۳۸ء عیسوی میں علی الترتیب ۱۸/۲ فیصدی، ۷/۱ فیصدی، ۱۷/۴ فیصدی رہا ہے۔ ایم ای ڈی کلاس میں ۳۸-۱۹۳۷ء اور ۳۹-۱۹۳۸ء میں مسلم طلباء کا اوسط فیصدی ۸/۲۸ ، ۵ اور بیس فی صدی تھا۔

داخلے کسی خاص قوم کی مقررہ تعداد کو پیش نظر رکھ کر نہیں کئے جاتے حقیقت واقعہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا تناسب نمائندگی کے اعداد مسلمانوں کی آبادی کے تناسب سے زیادہ ہیں۔ وظائف کی بابت یہ ہے کہ پٹنہ ٹریننگ کالج کے ڈپلوما ان ایجوکیشن اور ایم ای ڈی کلاسوں میں ۳۷-۱۹۳۶ء و ۳۹-۱۹۳۸ء کے سالوں میں مسلمان طلباء کو بیس فی صدی دیے گئے۔ یہی صورت داخلوں میں رہی۔

(۳) پٹنہ ٹریننگ سکول کے بارے میں ہمرشتہ نقشہ سے مسلمان امیدواروں کے تین سال کے اعداد معلوم ہوں گے داخلہ کا تناسب حسب ذیل رہا۔

۳۷-۱۹۳۶ء	سولہ (۱۶) فی صدی
۳۸-۱۹۳۷ء	چودہ (۱۴) فی صدی
۳۹-۱۹۳۸ء	سولہ (۱۶) فی صدی

منسلکہ نقشہ کی کیفیت کے خانہ میں مسلمانوں کی جو کمی دکھائی گئی ہے وہ بغیر وظیفہ کے داخلہ لینے والے مسلمان طلباء کی کافی تعداد نہ ہونے کے سبب سے ہے۔ مختلف قوموں کی تعداد کے تعین کے کوئی خاص قواعد نہیں ہیں۔

اسکولوں میں وظیفوں کی جگہوں کی بابت ذکر، نقشہ سے معلوم ہوگا کہ پچھلے تین سال کے عرصہ میں مسلمان امیدواروں کو بیس فی صدی دی گئیں۔ واضح ہو کہ ٹریننگ اسکول

میں وظیفوں کی مجموعی تعداد ۲۰ بیس ہے۔

(۴) دربھنگہ میڈیکل اسکول۔ گزشتہ چھ سال کے عرصہ میں دربھنگہ میڈیکل اسکول میں داخلہ کے حسب ذیل اعداد تھے ان اعداد سے ظاہر ہوگا کہ مسلمانوں کی نمائندگی کافی رہی اور گورنمنٹ اس قسم کے اداروں میں کسی قوم کے لئے نشستوں کی تخصیص کی ضرورت نہیں محسوس کرتی۔

سال	مسلم	غیر مسلم	مجموعی تعداد	کیفیت
۱۹۳۳ء	۱۳	۳۳	۴۶	
۱۹۳۴ء	۱۲	۳۴	۴۶	
۱۹۳۵ء	۱۱	۳۹	۵۰	
۱۹۳۶ء	۱۲	۳۳	۴۵	
۱۹۳۷ء	۱۱	۳۹	۵۰	
۱۹۳۸ء	۱۲	۳۷	۴۹	

ریزولیوشن نمبر ۲۲ ۔ پراونشل ہندی ساہتیہ سمیلن کو کوئی مستقل گرانٹ نہیں دی گئی ہے۔ البتہ سمیلن کے لئے ایک عمارت کی خریداری کی غرض سے دو ہزار پانچسو روپیہ گورنمنٹ نے یکمشت دیئے تھے۔ پراونشل گورنمنٹ نے اپنے بجٹ میں اردو لائبریری منگل تالاب پٹنہ سٹی کے لئے اردو داں پبلک کے فائدہ کے لئے پٹنہ میں ایک ضروری سامان سے مزین لائبریری مضبوط بنیاد پر قائم کرنے کی غرض سے روپیہ رکھا ہے۔

نمبر شمار	نام مدارس	تعداد مسلمان گریجویٹ مدرسین مع ال، ٹی ایس، ای، ایس میں	تعداد مولوی صاحبان دی، ای، ایس میں علاوہ عربی ٹیچرز کے	کیفیت
۱	پٹنہ کالجیٹ اسکول	۲	۱	
۲	پٹنہ ہائی اسکول	۲	۱	
۳	پٹنہ سٹی اسکول	۲		سکینڈ مولوی کی اسامی پر پٹنہ سٹی سکول میں ایک ہندو بابو سچیدانند کا تقرر گورنمنٹ کے احکام کے تحت کیا گیا تھا۔
۴	گیا ضلع سکول	۲	۲	
۵	آرہ ضلع سکول	۲	۱	
۶	چھپرا " "	۲	۱	
۷	موتی ہاری ضلع سکول	۲	۱	ایک اسامی ایس، ای، ایس کی جا گریڈ میں ایک مسلمان کو دی گئی۔
۸	مظفرپور ضلع سکول	۲	۱	
۹	نارتھ بروک سکول دربھنگہ	۳	۱	
۱۰	مونگھیر ضلع سکول	۲	۱	
۱۱	بھاگلپور ضلع سکول	۲	۲	
۱۲	پورنیا " "	۳	۲	

	نام مدارس	تعداد مسلمان گریجویٹ مدرسین مع آل ائی ایس ای ایس ایس	تعداد مولوی صاحبان دی ٹی ایس میں علاوہ عربی ٹیچروں کے	کیفیت
۱۳	ڈمکا ضلع سکول	۲	۱ ۰	ایک اسامی ایس ای ایس بغیر گریجویٹ بھی مسلمان کو دی گئی۔
۱۴	ہزاری باغ ضلع سکول	۳	۱	
۱۵	رانچی " "	۱	۳	
۱۶	پالامئو	۲	۱	
۱۷	پورنیا	۱	۴	
۱۸	چائی باسا	۱	۱	
۱۹	پٹنہ ٹریننگ سکول	۱	۰	
۲۰	پٹنہ پریکٹسنگ ایم ای سکول	۰	۳	
۲۱	مظفرپور ٹریننگ سکول	۱	۰	
۲۲	مظفرپور پریکٹسنگ سکول	۱	۰	
۲۳	بھاگلپور ٹریننگ سکول	۱	۰	
۲۴	بھاگلپور پریکٹسنگ ایم ای سکول	۱	۰	
۲۵	رانچی ٹریننگ سکول	۱	۰	
۲۶	رانچی پریکٹسنگ ایم ای سکول	۰	۳	

نمبر	سوالات	پٹنہ ٹریننگ کالج: ڈپلوما ان ایجوکیشن کلاس	پٹنہ ٹریننگ کالج: ایم ای ڈی کلاس	پٹنہ ٹریننگ سکول: سی ٹی کلاس	کیفیت
۱	تعداد مسلم طلبا درج رجسٹر بابت گزشتہ تین سال				(۱) ۱۸ر۲ فیصدی داخل شدہ طلباء کی مجموعی تعداد میں سے یعنی ۴۴
	۳۶-۱۹۳۷ء	۱۸ (۱)	-	۸	(۲) ۱۷ر۷ فی صدی داخل شدہ طلباء کی مجموعی تعداد میں سے یعنی ۴۵
	۳۷-۱۹۳۸ء	۸ (۲)	۲ (۲)	۸	(۳) ۱۷ر۴ فی صدی داخل شدہ طلباء کی مجموعی تعداد میں سے یعنی ۴۶ (علاوہ ۷ طالبات مسلم گرلز)
	۳۸-۱۹۳۹ء	۸ (۳)	۱ (۵)	۴	(۴) ۲۸ر۵ فی صدی داخل شدہ طلباء کی تعداد میں سے یعنی ۷ یہ اعداد صرف سیکنڈ ایر کلاس کے ہیں۔ پہلا سال ختم طلباء کا ہو گیا ہے اور وہ صوبہ کے

نمبر	سوالات	پٹنہ ٹریننگ کالج: ڈپلوما ان ایجوکیشن کلاس	پٹنہ ٹریننگ کالج: ایم ای ڈی کلاس	پٹنہ ٹریننگ سکول: سی ٹی کلاس	کیفیت
					دوسرے تین ٹریننگ سکولوں میں بھیج دئے گئے ہیں ان میں سے ۱۶ ہندو وظیفہ یاب طلبا ہیں اور پانچ مسلمان ہیں جن میں سے چار کو وظیفہ ملتا ہے۔
۲	تعداد ہندو وظیفہ یاب طلبہ۔				۲۰۵ ۰، فی صدی یعنی ۵
	۱۹۳۶-۳۷ء	۱۱	۵	۳۲	
	۱۹۳۷-۳۸ء	۲۲	۴	۳۲	
	۱۹۳۸-۳۹ء	۴ + ۲××	۴	۱۶ + ۲	دو ہندو خواتین
۳	تعداد مسلمان وظیفہ یاب طلبہ				
	۱۹۳۶-۳۷ء	۳ (اے)		۸	۱۵ وظیفہ یاب میں سے ۲۰ فی صدی۔
	۱۹۳۷-۳۸ء	۱۲ (اے)	۱ (بی)	۸	( ) ۵ وظیفہ یاب طلبا سے ۲۰ فی صدی۔
	۱۹۳۸-۳۹ء	۱ (سی)	۱ (بی)	۴	(سی) ۲۰ فی صدی یعنی ۵۔

پٹنہ ٹریننگ سکول میں داخلہ کی تفصیل

سال	کل تعداد داخلہ	ہندو	مسلم	مسلمان وظیفہ پانے والے کی تعداد	ہندو وظیفہ پانے والے کی تعداد	تعداد بغیر وظیفہ پانے والے مسلمانان	کیفیت
۳۷-۱۹۳۶ء	۳۰	۲۲	۵	۴	۱۵	۱	بغیر وظیفہ کے داخلہ لینے والے امیدواروں میں سے بمقابلہ ۱۵ صرف ۲ مسلمانوں نے اپنے کو پیش کیا۔
۳۸-۱۹۳۷ء	۳۰	۲۶	۴	۴	۱۶	—	کسی مسلمان نے بغیر وظیفہ کے داخلے لینے کیلئے اپنے کو پیش نہیں کیا۔
۳۹-۱۹۳۸ء							
طفل طلباء	۳۰	۲۵	۵	۴	۱۶	۱	بغیر وظیفہ کے جن ۹ امیدواروں نے داخلہ لینے کیلئے اپنے کو پیش کیا ان میں صرف ۲ مسلمان تھے یہ طالب علم اب صوبہ کے مختلف ٹریننگ اسکولوں میں بھیج دئے گئے ہیں
طالبات سی ٹی سیکشن	۹	۳	×	×	۲		کسی مسلمان لڑکی نے داخلہ کی درخواست نہیں دی
ورنیکلر سیکشن	۶۲	۴۹	۱۳	۱۳	۴۹		ایک مسلمان طالب علم نے داخلہ لینے کے بعد اسکول چھوڑ دیا اور چار طالب علموں نے انتخاب کے بعد داخلہ نہیں لیا۔

ان جوابات کے موصول ہونے پر اُن کو ۱۲ر جون ۱۹۲۹ء کو لیڈی اینس امام صاحبہ صدر مجلس استقبالیہ اجلاس کانفرنس پٹنہ کی خدمت میں بھیجا گیا اور لکھا گیا کہ ازراہ کرم بعد مشورہ مقامی ماہرین تعلیم مطلع فرمایئے کہ گورنمنٹ بہار کے یہ جوابات کس حد تک قابل اطمینان ہیں نیز اس امر سے بھی مطلع فرمایئے کہ اس سلسلہ میں ہم کو مزید کیا کارروائی کرنی چاہیئے لیڈی صاحبہ کے پاس سے کوئی جواب نہیں آیا ہے انتظار ہے۔

صوبۂ بہار سے متعلق پانچواں رزولیوشن پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے قیام کے بارے میں تھا۔ اس کے لیے پندرہ ۱۵ اصحاب کی ایک عارضی کمیٹی جس کے مولوی سید محمد حفیظ صاحب ایڈوکیٹ ایم ایل۔سی کنوینر تھے مقرر کی گئی لیکن ارکان کمیٹی میں آپس میں اختلافات تھے کوئی خاص کام نہ ہو سکا۔ مولوی حفیظ صاحب سے بعد اجلاس کمیٹی کا جلسہ طلب کرنے کے متعلق گفتگو کی گئی نیز ۲ر نومبر ۱۹۲۹ء کو ایک یاددہانی کا خط بھی لکھا گیا لیکن مخالف ناخوشگوار حالات کی بنا پر موصوف کوئی عملی قدم اس خصوص میں نہ اٹھا سکے اور آخر جولائی ۱۹۳۰ء کو منشی مصطفےٰ احسن سفیر کانفرنس کو بھی صوبۂ بہار میں پراونشل ایجوکیشنل کانفرنس کی شاخ قائم کرانے کی غرض سے پٹنہ بھیجا گیا مگر حصول مقصد میں کامیابی نہ ہوئی۔

چھٹے رزولیوشن میں پٹنہ یونیورسٹی کے چانسلر صاحب سے درخواست کی گئی تھی کہ چونکہ مسلمانوں کی نمائندگی یونیورسٹی سینیٹ میں نہایت ناکافی ہے اُن کے تناسب نمائندگی میں خاطر خواہ اضافہ کیا جائے۔

اس رزولیوشن کی نقل جناب چانسلر صاحب پٹنہ یونیورسٹی کی خدمت میں بھیجی گئی کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ اس کے بعد خان بہادر مرزا اختر حسین صاحب اسسٹنٹ رجسٹرار پٹنہ یونیورسٹی کی وساطت سے رزولیوشن مذکور وائس چانسلر صاحب کی خدمت میں بھی بھیجا گیا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

ساتویں رزولیوشن میں پٹنہ مسلم اسکول کے قیام پر اس کے کارکنوں کو مبارکباد دی گئی تھی اور مسلمانان بہار سے توقع ظاہر کی گئی تھی کہ وہ اسکول مذکور کو قائم رکھنے اور ترقی دینے کی کوشش کریں گے۔

اس رزولیوشن کی بہار کے اخبارات میں اشاعت کی گئی اور اس کی ایک نقل سکریٹری صاحب مسلم اسکول پٹنہ کی خدمت میں ارسال کی گئی

آٹھویں رزولیوشن کے ذریعہ محمڈن ایجوکیشن کمیٹی بہار سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ محمڈن اینگلو عربک اسکول پٹنہ سٹی کو جلد از جلد کالج کے درجہ تک پہونچا دے۔ ۲۶ر اکتوبر ۱۹۳۸ء کو اس رزولیوشن کی نقل ایک خط کے ساتھ آنریری سکریٹری محمڈن ایجوکیشن کمیٹی بہار پٹنہ کو بھیجی گئی۔ ۱۴ر دسمبر ۱۹۳۸ء کو موصوف نے رسیدو شکریہ کا خط بھیجا۔

پٹنہ کے اجلاس کانفرنس میں ۸ رزولیوشن عام تھے۔ پہلے میں ہندوستان کی مختلف صوبائی گورنمنٹوں سے مسلمان اسسٹنٹ ڈائریکٹر اور انسپکٹر اور سب اسسٹنٹ انسپکٹروں کے تقرر کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ دوسرے میں انجمن ترقی اردو سے اردو رسم الخط پر غور کرنے کے لئے ایک کمیٹی کے تقرر کی خواہش کی گئی تھی۔ تیسرے میں اردو زبان کے متعلق مسلمانوں کی پالیسی کا اعلان کیا گیا تھا اور چوتھے رزولیوشن میں گورنمنٹ آف انڈیا سے درخواست کی گئی تھی کہ مائننگ انجنیرس کی کمی کو پورا کرنے کے لئے دھنباد اسکول آف مائننگ میں مسلمان طلباء کی تعلیم کا خاص لحاظ رکھا جائے۔

یہ رزولیوشن مختلف صوبوں کی گورنمنٹیں، سکریٹری صاحب انجمن ترقی اردو اور گورنمنٹ آف انڈیا کو بھیجے گئے اور ان کی کانفرنس گزٹ نیز ملک کے تمام مشہور اردو اور انگریزی اخبارات میں اشاعت کی گئی۔

تعلیمی وظائف

کانفرنس کا سب سے بڑا مقصد تعلیم کی ترقی و اشاعت ہے اس لئے وہ اپنے محدود وسائل کے مطابق اس مقصد کے لئے برابر کام کرتی رہتی ہے، کانفرنس کا سالانہ اجلاس، تعلیمی مسائل پر غور و بحث، تجاویز کا پاس کرنا، سفیروں کے دورے، اور حکومت سے مطالبات ان سب کاموں کا مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم میں ہر قسم کی سہولتیں

بہم پہنچائی جائیں، تاکہ وہ زیادہ تعداد میں تعلیم حاصل کر سکیں۔ اسی سلسلہ میں تعلیمی وظائف بھی ترقی تعلیم کا ایک ذریعہ ہیں۔ اس لئے کانفرنس نے طلبہ کی مالی امداد پر بھی شروع سے اپنی توجہ مبذول رکھی ہے،

یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی مالی حالت ناگفتہ بہ ہے اور موجودہ تعلیم نہایت گراں، اس لئے ہزاروں مسلمان بچے محض افلاس کی وجہ سے تعلیم سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اسی بناء پر کانفرنس نے سرسید کے زمانہ سے طلبہ کو مالی امداد دینے کا طریقہ اختیار کیا ہے جو اس وقت تک جاری رہا ہے، لیکن یہ امداد ایک محدود پیمانہ پر ہے کیونکہ کانفرنس کے وسائل و ذرائع اس قدر وسیع نہیں ہیں کہ وہ ہر ضرورتمند طالب علم کی وظیفہ سے امداد کر سکے، ہندوستان کا کوئی صوبہ بھی ایسا نہیں ہے جہاں ہزاروں غیر مستطیع طلبہ موجود نہ ہوں، کانفرنس ان سب کی مالی امداد کس طرح کر سکتی ہے، تاہم جس قدر ممکن ہے وہ بلاقید صوبہ اور فرقہ بہت سے مسلمان طلبہ کی سال بسال امداد کرتی ہے جس کی اجمالی کیفیت ہر سال کی رپورٹ میں شائع ہوتی رہتی ہے، چنانچہ گزشتہ سال بھی کانفرنس نے حسب معمول طلبہ کی مالی امداد کی جس کی کیفیت ذیل کے گوشوارہ سے معلوم ہوگی،

گوشوارہ وظائف بابت ۳۹-۱۹۳۸ء

اپریل ۱۹۳۸ء لغایت مارچ ۱۹۳۹ء

نمبر شمار	نام صیغہ	کانفرنس: تعداد	کانفرنس: رقم	نواب صدر یار جنگ بہادر: تعداد	نواب صدر یار جنگ بہادر: رقم	میزان: تعداد	میزان: رقم	کیفیت
۱	میڈیکل	۹	[illegible]			۹	[illegible]	
۲	طب یونانی	۱۶	[illegible]	۵	۲ روپے	۲۱	[illegible]	
۳	ٹریننگ	۶	[illegible]			۶	[illegible]	
۴	انجینئرنگ	۱	۳۰			۱	۳۰	
۵	ٹیکنیکل	۳	۱۰۶			۳	۱۰۶	
۶	عام تعلیم	۷	[illegible]	۳	۲۲۲	۱۰	[illegible]	

نمبر شمار	نام صیغہ	کانفرنس: تعداد	کانفرنس: رقم			نواب صدر یار جنگ بہادر: تعداد	نواب صدر یار جنگ بہادر: رقم			میزان: تعداد	میزان: رقم			کیفیت
۷	عربی کے لیے	۹	۰	۰	[illegible]					۶	۰	۰	[illegible]	
۸	جہازرانی	۱			۹۰					۱			۹۰	
۹	گرلس کالج	۱			۹۶					۱			۹۶	
۱۰	اسکول آف سائنس	۱			۳۰					۱			۳۰	
۱۱	انجینیری	۱			۳۶					۱			۳۶	
۱۲	قانون	۱			۵۴					۱			۵۴	
	میزان	[illegible]		[illegible]	[illegible]	۸		[illegible]	[illegible]	[illegible]		۶	[illegible]	

مندرجہ بالا مستقل وظائف کے علاوہ ۱۲۹ بطور امداد تعلیمی کتابوں وغیرہ کی صورت میں ۲۷ طلبہ کو دیے گئے۔

امداد مکاتب و مدارس

تعلیم کی ترقی و اشاعت کا ایک بڑا ذریعہ مکاتب و مدارس بھی ہیں جہاں بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ جن قوموں کی مالی حالت اچھی ہے اُن کے مدارس کی تعداد بھی زیادہ ہے اور اسی نسبت سے پڑھنے والوں کا فی صدی اوسط بھی بڑھا ہوا ہے۔ عوام کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو خواندہ بنانا اور ابتدائی تعلیم کا وسیع پیمانہ پر انتظام کرنا ہر قوم کا ایک اخلاقی فرض ہے۔ اسی بنا پر ہندوستان کی مختلف قوموں نے فرقہ وارانہ مدارس قائم کیے ہیں جہاں اُن کی قوم کے بچے تعلیم پاتے ہیں۔ مسلمانوں نے بھی کسی قدر اس طرف توجہ کی ہے اور مختلف مقامات پر ابتدائی تعلیم کے مکاتب یا اسکول قائم کیے ہیں لیکن اُن کی تعداد ضرورت سے بہت کم ہے اور مالی حالت بھی ناقابل اطمینان۔

کانفرنس کے وسائل اتنے وسیع نہیں ہیں کہ وہ ضرورت کے مطابق خود مکاتب

قائم کرے یا جو پہلے سے قائم ہیں ان کی مستقل مالی امداد کرسکے، تاہم کانفرنس نے اس ضرورت کو نظر انداز نہیں کیا ہے، وہ مسلمانوں کو مکاتب و مدارس قائم کرنے کے لیے مسلسل ترغیب دیتی اور تحریک کرتی رہتی ہے، یہاں تک کہ بعض دفعہ ان مدارس یا تعلیمی انجمنوں کا کام کرنے اور چندہ جمع کرنے کے لئے اپنے سفیروں کی خدمات بھی منتقل کردیتی ہے۔ اس کے علاوہ عموماً اپنے سالانہ اجلاس کے موقع پر بھی کسی خاص مقام پر اسکول قائم کرنے یا کسی قائم شدہ اسکول کو ترقی دینے کیلئے تجاویز پیش کرتی اور عملی تدابیر اختیار کرتی ہے یہ کوشش عموماً اس مقام کے متعلق ہوتی ہے جہاں اجلاس منعقد ہوتا ہے، چونکہ اجلاس کی وجہ سے اس صوبہ کے بہت سے با اثر اور صاحب وجاہت مسلمان جمع ہو جاتے ہیں اس لئے جیسا کوئی ایسی تحریک کی جاتی ہے جو اس صوبہ کے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی سے تعلق رکھتی ہے تو عموماً لوگ اس سے دلچسپی لیتے ہیں اور انہیں چندہ جمع کرنے اور اس تحریک یا تجویز کے متعلق کام کرنے میں تامل نہیں ہوتا بلکہ کچھ لوگ اس حد تک تیار ہو جاتے ہیں کہ وہ اجلاس کے بعد بھی اس تحریک کو چلاتے رہتے ہیں، غرض کانفرنس کی تحریک و ترغیب سے مختلف مقامات پر مسلمانوں کے مکاتب و مدارس قائم ہو چکے ہیں۔

ان تدابیر کے علاوہ کانفرنس خود بھی بعض مقامات پر جہاں زیادہ ضرورت ہو مکاتب قائم کرتی ہے یا جو پہلے سے موجود اور مالی مشکلات میں مبتلا ہیں ان کی مستقل مالی امداد کرتی ہے، اس امداد کی تفصیل اور مکاتب کے نام سالانہ رپورٹ میں شائع ہوتے رہتے ہیں، گزشتہ سال اس مد میں کانفرنس نے جو مالی امداد دی اس کی تفصیل حسب ذیل ہے

امداد مدارس و انجمن ہائے اسلامیہ بابت ۳۹-۱۹۳۸ء

اپریل ۱۹۳۸ء لغایت مارچ ۱۹۳۹ء

نمبر شمار	نام	نام			رقم			کیفیت
۱	مدرسہ اسلامیہ	اوسارہ	ضلع	میرٹھ	۴۲۳	۰	۰	
۲	״	بجے پور			۱۸۳			
۳		سہاور	ضلع	ایٹہ	۱۲۱	۸	۰	

نمبر شمار	نام		رقم			کیفیت
٤	مدرسہ اسلامیہ	سکندرہ ضلع علی گڑھ	١٢١	٨	٠	
٥		کرنول میرٹھ	٧٣	٨	٠	
٦		رٹھیورہ ،،	٧٣	٨	٠	
٧		فولاد نگر ،،	٨٥	٨	٠	
٨		ڈہاکہ پوری سہارنپور	٩١	٨	٠	
٩	دارالعلوم ماجدیہ	چھپول ریاست جے پور	١٢١	٨	٠	
١٠	مدرسہ انوار الاسلام	جے پور	٤١	٨	٠	
١١	انجمن اسلام	سوائی مادھوپور ریاست جے پور	١٢١	٨	٠	
١٢	انجمن ہدایت الاسلام	گنگاپور سٹی ،، ،،	٨٥	٨	٠	
١٣	مدرسہ مسلم طالبات	منگلور ضلع سہارنپور	٨٥	٨	٠	
١٤	اسلامیہ گرلس اسکول	بریلی	١٢١	٨	٠	
١٥	نذیریہ گرلس اسکول	دہلی	٤١	٤	٠	
١٦	آل احمد گرلس اسکول	امروہہ ضلع مرادآباد	٨٥	٨	٠	
١٧	شمیم فاطمہ نسواں اسکول	مارہرہ ایٹہ	٨٥	٨	٠	
١٨	مدرسہ اسلامیہ	رام پورہ	٧٣	٨	٠	
١٩	انجمن اصلاح المضافات	علی گڑھ	٩٦	٠	٠	
٢٠	اسلامیہ اد کڈن اسکول	نئی بستی علی گڑھ	٨٠	٠	٠	
٢١	مدرسہ اسلامیہ	کٹرہ محمد سعید خاں علی گڑھ	١٢٠	٠	٠	
٢٢	اسلامیہ گرلس اسکول	تالاب نواب ہدایت خاں ،،	٦٠			
٢٣	مدرسہ اصلاح المسلمین	بوندی	١٢١	٩	٠	
٢٤	انجمن عربی صوبہ متحدہ	الہ آباد	٣٨	٠	٠	
٢٥	مدرسہ اسلامیہ	ہردوا گنج ضلع علی گڑھ	١٠	٠	٠	
		میزان کل	٢٣٩١	٦	٠	

سفیروں کا دورہ

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اپنے اغراض و مقاصد کی اشاعت اور دوسری تعلیمی و اصلاحی خدمات انجام دینے کے لئے ہندوستان کے مختلف صوبوں میں سفیروں کو دورہ کرنے کے لئے بھیجتی رہتی ہے یہ سفیر مسلمانوں کو کانفرنس کا ممبر یا وزیٹر بناتے ہیں، اور تعلیمی وظائف یا امداد مکاتب کے لئے عطیات بھی وصول کرتے ہیں،

بعض سفیر کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے قریب ہنگامی طور پر بھی مقرر کرلئے جاتے ہیں جو دورہ کرکے مسلمانوں کو کانفرنس کے اجلاس میں شریک ہونے کی ترغیب دیتے اور چندہ ممبری وصول کرتے ہیں،

گزشتہ سال کانفرنس کے سفیروں نے جو چندہ وصول کیا اس کی کیفیت ذیل کے گوشوارہ سے معلوم ہوگی،

رقم وصول شدہ بذریعہ سفیران از اپریل ۱۹۳۸ء لغایت مارچ ۱۹۳۹ء

نمبر شمار	نام	رقم			کیفیت
۱	مسٹر عبدالکریم فاروقی بی اے	۷۵۲	۸	۰	
۲	منشی مصطفیٰ حسن صاحب زبیری	۱۰۷۰	۰	۰	
۳	منشی انعام الحق صاحب عثمانی	۱۸۰	۰	۰	گوالیار، کرنال
۴	میر ہدایت علی صاحب	۱۹۴	۰	۰	رام پور
۵	محمد مختار صاحب آزاد	۵۰۴			دتیا، دہلی، بریلی،
۶	منشی شان الہی صاحب	۱۳۷	۶	۹	حیدرآباد
۷	مشترانہ دلال اشتہاریہ	۵۰۵۰			

کانفرنس کے مقرر کردہ سفیروں کے علاوہ جو ملک کے مختلف حصوں میں دورہ کرتے رہتے ہیں، کانفرنس کے دوسرے عہدہ دار بھی حسب ضرورت تعلیمی جلسوں اور

قومی انجمنوں میں شرکت کرنے یا مدارس اسلامیہ کا معائنہ کرنے کے لئے سفر کرتے رہتے ہیں اور بروقت ضرورت تعلیمی تحریکوں اور جلسوں میں عملی حصہ لیکر کام کرنے والوں کی مدد کرتے اور انھیں مفید مشورے دیتے ہیں،

اس کے علاوہ خود صدر دفتر کانفرنس میں بھی عام تعلیمی معاملات یا کسی خاص تعلیمی اسکیم پر غور کرنے کے لئے کانفرنس کے ممبروں اور ماہرین تعلیم کا اجتماع ہوتا رہتا ہے، چنانچہ وارد ھا اسکیم پر غور و بحث کرنے کے لئے نیز مسلمانان صوبجات متحدہ کے چالیس مطالبات کے سلسلہ میں صدر دفتر کانفرنس میں متعدد بار ماہرین اور ممبروں کا اجتماع ہوا، اور تمام زیر بحث معاملات پر مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے غور کرکے ضروری یادداشتیں اور مطالبات مرتب کئے گئے، جو حکومت کے پاس بھیجے گئے، اور ملک میں مشتہر کئے گئے، ان جلسوں کی مفصل کیفیت اور کارگزاری کانفرنس گزٹ علی گڑھ اور دوسرے اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہے،

آخر میں نہایت افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ بحالت موجودہ تعلیمی تحریکوں سے مسلمانوں کو اس قدر دلچسپی نہیں ہے جس کی ضرورت ہے، مروجہ تعلیم میں ایک زبردست انقلاب ہو رہا ہے اور جدید تعلیمی اسکیمیں تیار ہو رہی ہیں جن میں مسلمانوں کی ضروریات کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے، اس لئے شدید ضرورت ہے کہ مسلمان اپنے نقطۂ نظر کے مطابق ان تعلیمی اسکیموں پر غور کریں اور یہ کوشش کریں کہ ان اسکیموں میں مسلمانوں کی مخصوص تعلیمی ضروریات کا لحاظ رکھا جائے،

ہمایوں نامہ

یعنی سوانح عمری ہمایوں بادشاہ الملقب بہ نصیر الدین کا اردو ترجمہ

یہ کتاب ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم نے فارسی زبان میں تصنیف کی ہے، اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ نہایت صحیح، معتبر اور چشم دید واقعات پر مبنی ہے، ایک خاص بات یہ ہے کہ شاہی محلات اور بیت سے دوسرے معاملات کے متعلق اس کتاب میں ایسے دلچسپ واقعات لکھے گئے ہیں، جو ایک مورخ کے دسترس سے باہر ہیں اور جن کو صرف شہنشاہ ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم ہی لکھ سکتی تھیں، یہ اردو کی خوش نصیبی ہے کہ اس کے تاریخی وادبی ذخیرہ میں ایسی کتاب کا اضافہ ہوا، جو صحیح معلومات کا ایک بے بہا خزانہ ہے۔

قیمت ... ... عہ ر

صولت شیر شاہی

یعنی سوانح عمری سلطانِ عادل شاہ شیر شاہ سوری رحمۃ اللہ علیہ

ہندوستان کے اسلامی عہد حکومت کی تاریخ میں شیر شاہ کو جو شہرت وعظمت حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ اس اولوالعزم وعادل فرمانروا نے محض اپنی ہمت وشجاعت اور حسن تدبیر سے ہندوستان کی سلطنت حاصل کی اور پھر بڑی قوت وقابلیت تدبیر اور عدل وانصاف سے حکمرانی کے فرائض ادا کئے نیز ایسے آئین وقوانین وضع کئے جن کی نظیر مشکل سے مل سکتی ہے۔ شیر شاہ کی کوئی مفصل لائف اردو میں نہیں تھی، اب کانفرنس نے یہ لائف شائع کی ہے جو اصلی ومعتبر ماخذوں سے مرتب کی گئی ہے۔

یہ کتاب ایک دیباچہ اور سات ابواب پر مشتمل ہے آخر میں ایک مبسوط ضمیمہ ہے جس میں آل سور کے حالات بیان کئے گئے ہیں اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ شیر شاہ کیسے عجیب با دل ودماغ کا فرمانروا تھا اور اس کے کارنامے وآئین حکومت کس قدر حیرت انگیز اور دلچسپ ہیں۔ ضخامت ۱۶۰ صفحے قیمت صرف۔ ایک روپیہ ... ... صہ ر

ملنے کا پتہ۔ صدر دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل علی گڑھ۔

خطبات صدارت پنجاہ سالہ جوبلی

مارچ ۱۹۳۷ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی پنجاہ سالہ جوبلی کا جو اجلاس علی گڑھ میں منعقد ہوا تھا وہ متعدد شعبوں پر تقسیم کر دیا گیا تھا ہر شعبہ کا مستقل صدر تھا چنانچہ ان شعبوں میں بارہ خطبات صدارت ماہرین فن نے پڑھے جن کا مجموعہ کانفرنس نے شائع کر دیا ہے۔ ضخامت مع ٹائٹل ۲۴۰ صفحات قیمت ۸؍

فہرست خطبات پنجاہ سالہ جوبلی

ملنے کا پتہ

معتمد دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل علی گڑھ

خطبۂ صدارت

نواب کمال یار جنگ بہادر

جو

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل

کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ

کلکتہ میں

بتاریخ ۲۹ ڈسمبر ۱۹۳۹ء پڑھا گیا

مطبوعہ

اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

معزز حاضرین۔

میں اُس اعزاز کے لئے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہون جو آپ نے اس عظیم الشان مُسلم اِدارہ کی صدارت کیلئے مجھکو مدعو کر کے عطا کیا ہے اور میں اپنے آقائے ولی نعمت اعلیٰحضرت خسرو دکن و برار کے لئے اپنے دِل میں عمیق جذبات شکرگزاری محسوس کرتا ہون کہ حضرت جہاں پناہ اپنے اِس غلام کو آپ کی دعوت قبول کرنیکی اجازت عطاء فرمائی ہیں آپ کو یقین دِلاتا ہون کہ میں نے آپ کی دعوت کو ایک فرض سمجھ کر قبول کیا ہے اور مجھے اِعتراف ہیکہ میں نے ایک بہت بڑی ذمہ داری اپنے سر لی ہے۔ اُصول فنِ تعلیم سے میں بے بہرہ ہون اور اُن ممتاز ماہرین تعلیم کی رہنمائی کے لئے جو اِس وقت یہاں جمع ہیں میں مشکل موزوں ہوسکتا ہون خاص کر ایسے زمانہ میں جبکہ دُنیا ایک

ہولناک انتشار کی حالت میں ہے اور جبکہ وہ نصب العین جس کو ہم عزیز رکھتے تھے ایک غیر معمولی کشمکش میں مبتلا ہوگیا ہے۔ پس میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ ازراہِ کرم میری کوتاہیوں کو نظر انداز فرمائیں۔

جیسا کہ میں نے ابھی آپ سے کہا ہے میں اُصول فنِ تعلیم سے بے بہرہ ہوں اور اپنے خیالات کو کسی ایسے مخصوص نظریۂ تعلیم کی روشنی میں پیش نہیں کرسکتا جو ماہرین تعلیم کے لئے قابل قبول ہوسکیں۔ ایک شہری کی حیثیت سے میں تعلیم کو اس نظر سے دیکھتا ہوں کہ یہ ایک تیاری ہے کشمکشِ حیات کے لئے، ایسی کشمکش جو کسی مقصدِ عظیم کے تحت جاری رہتی ہے اور رہنی چاہیئے۔ اِس نقطۂ نظر سے تعلیم ایک ذریعہ ہے زندگی اور باعزت زندگی بسر کرنے کی قوت حاصل کرنیکا۔ اور جہاں تعلیم ایسی قوت عطا نہیں کرتی میں اُس کو اپنے مستقل مفادات کے لئے مضر سمجھتا ہوں اور وہ میری دلی مخالفت کی مستحق ہے۔ حاضرین میں چاہتا ہوں کہ یہی نقطۂ نظر آپ اپنے بچوں کی تعلیم سے متعلق اِس وقت اختیار کریں

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنے قابلِ یادگار تاریخی دور میں مسلمانان ہند کی عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اسکے بانی اعظم سر سید احمد خان اور اُن کے جانشینوں کی یاد تازہ رکھتے ہیں جنہوں نے اس ادارہ کے ذریعہ مسلمانان ہند کے ذہن میں اِس امر کا ایک بڑھتا ہوا شعور پیدا کیا کہ انہیں اِس ملک کی ترقی میں کیا حصہ لیا ہے۔ لیکن اب اِس ادارہ کو گزشتہ قائدین سے زیادہ ایک عظیم تر ذمہ داری ہے

عہدہ برآ ہوتا ہے۔ قانون حکومت ہند بابتہ ۱۹۳۵ء نے برطانوی ہند کے صوبجات میں خودمختاری نافذ کردی ہے جس سے ابنائے وطن کو اپنی تعلیمی پالیسی تشکیل دینے کا حق حاصل ہوگیا ہے۔ قانون مذکور کا وفاقی جزو ابھی رُو بہ عمل نہیں آیا لیکن مستقبل قریب میں مرکزی حکومت میں کوئی نہ کوئی تغیر ناگزیر ہوگا۔ بہت ممکن ہے کہ اس قانون میں ترمیم ہوجائے یا یہ سارا قانون مسترد ہوکر کوئی نیا قانون تشکیل پاجائے جو ملک کو آزادی کی منزل کی طرف ایک قدم آگے لے جائے اور عوام الناس کو اپنی پالیسی تشکیل دینے کے زیادہ سے زیادہ اختیارات حاصل ہوجائیں۔ ایسے عظیم الشان تغیر کے موقع پر وہ کونسی چیز ہے جو آپ کے لئے جاذب توجہ ہو۔

گزشتہ ڈہائی سال کے واقعات کی رفتار نے یہ ظاہر کردیا ہے کہ صوبہ واری مجالس مقننہ میں ایک واحد مذہبی فرقہ ایک اکثریتی جماعت تشکیل دیسکتا ہے اور اگر وہ ٹھان لے تو اپنی تہذیب کو جو اوسکے مذہب کی آفریدہ ہے سارے صوبہ میں پھیلا سکتا ہے ایسے حالات میں اقلیت خسارہ میں رہتی ہے جیسا کہ مسلم جماعت رہی ہے۔ کیا آئندہ تغیرات میں ایسے حالات کو دُہرانے کی اجازت دینگے۔ یا آپ عملی آدمیوں کی طرح اپنا تعلیمی لائحہ عمل قبل از قبل مُرتب کرکے اپنے تعلیمی نصب العین کو متعین کردینگے اور اس بات پر اصرار کرینگے کہ آئندہ نظام میں اس نصب العین کا دستوری حیثیت سے تحفظ کیا جائے۔

میں اس امر سے بخوبی واقف ہوں کہ مسلمان ایک جماعت کی حیثیت سے اُن تعلیمی اسکیموں سے مطمئن نہیں ہیں جو مختلف گوشوں سے پیش ہوتی رہی ہیں۔ یہاں

کسی خاص اسکیم کا ذکر کرنا ضروری نہیں لیکن ایک چیز کے متعلق مجھے یقین ہے کہ مستقبل میں کوئی نظام تعلیم قابل قبول نہ ہوگا جو ہم میں ایسے ذہنی، روحانی، اور اخلاقی صفات نمود دینے سے قاصر رہے جن کی وجہ سے ہم اسلامی روح اور تہذیب کے محافظ بن سکتے ہیں وہ اسلام جو نوع انسان کی ترقی کے لئے اپنا ایک پیام رکھتا ہے۔

جیسا کہ ہر مسلمان جانتا ہے اسلام محض ایک جذبہ کا نام نہیں اور نہ یہ ایک ایسی مجرد خصوصیت ہے جو کسی فرد کی خانگی زندگی تک محدود رہے۔ یہ درحقیقت اجتماعی زندگی کا ایک طریقہ ہے اور اس کو ہر نظام تعلیم میں جگہ ملنی چاہیئے جو ہمارے بچوں کے لئے مرتب کیا جائے۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف کے الفاظ میں۔

"اسلام کا مقصد ایک ایسا اجتماعی نظام قائم کرنا ہے جو زندگی کے دو بنیادی حقائق پر زور دیتا ہو۔ ایک جس کو میں حرکت حیات کے نام سے تعبیر کرتا ہوں اور دوسرا وحدت حیات اور یہ دونوں ایک ایسے لائحہ عمل کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کو "شریعت" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ آپ اس "شریعت" کو "قانون" اسلام بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس قانون اور اس لائحہ عمل کے حدود کے اندر ایک مسلمان کو زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔ یہ حدود درحقیقت

ننگ نہیں ہیں جیسا کہ وہ ہماری موجودہ جہالت اور انحطاط کی حالت
میں نظر آتے ہیں۔ تاریخ اسلام میں واقعات کی رفتار نے بار بار
ثابت کر دیا ہے کہ جس حد تک زندگی کے یہ دو بنیادی حقائق حرکت
و وحدت پیش نظر رکھے گئے اُس حد تک شریعت اسلام نے اپنے
پیروؤں میں زندگی اور قوت پیدا کرتی رہی ۔"

پس یہ اَمر پیش نظر رہے کہ جس قسم کا تعلیمی نظام بھی آپ اپنے بچوں کیلئے مرتب کریں اُس کو زندگی کے اُن عظیم الشان حقائق کے مطابق ہونا چاہیئے جس کا اسلام علمبردار ہے۔ اگر ہمارے بچوں کی تعلیم میں اُن حقائق تک پہونچنے کے لئے راستے مسدود کر دیئے گئے تو ظاہر ہے کہ ایسی تعلیم بے ثمر ثابت ہوگی۔

گاندھی جی ۲۴ر ڈسمبر ۱۹۳۸ء کے ہریجن میں کہتے ہیں کہ "آج انسان کی سرگرمیوں کا سارا دائرہ ایک ناقابل تقسیم کُل ہے۔ آپ سماجی، معاشی، سیاسی اور خالص مذہبی سرگرمیوں کو الگ الگ دائروں میں محدود نہیں کر سکتے۔ انسانی جد و جہد سے علیحدہ مجھے کوئی مذہب نظر نہیں آتا۔ مذہب تمام سرگرمیوں کیلئے ایک اخلاقی بنیاد فراہم کرتا ہے اس کے بغیر زندگی ایک شور و غوغا بنکر رہ جاتی ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ ہم مسلمان اپنے بچوں کی تعلیم میں ایک تہذیبی پس منظر کو اس قدر اہمیت دیتے ہیں۔ اسلام نے جس تہذیب کو نمو دیا ہے وہ تہذیب رواداری وحدت اور اُنس پر مبنی ہے اور اگر آج مسلمان اپنے اس

ورثہ کو حاصل کرنے کے لئے مستردہیں تاکہ وہ اپنی مادر وطن کی زیادہ خدمت کرسکیں تو ایسی روش میں کونسی چیز ہے جو مخالفت کو اُبھار سکتی ہے؟

میری رائے میں اِس کانفرنس کو چاہیئے کہ اِس امر کے متعلق کہ اُن حالات کے مدنظر جن میں ہم اِس ملک میں گھرے ہوئے ہیں ہمارے بچوں کے لئے کس قسم کی تعلیم موزوں ہوگی۔ اپنے خیالات فوراً مرتب کرے۔

ہر نظام تعلیم میں جو مسلمانوں کے لئے تشکیل دیا جائے دو ابتدائی مقاصد پیش نظر رہنے چاہیئے۔

(۱) اِسلامی تہذیب کی امتیازی خصوصیات کا تحفظ۔

(۲) اسلامی نظام اجتماعی کا استحکام۔

متذکرۂ صدر مقاصد کے حصول کے لئے ایک نظام تعلیم تشکیل دینے کا کام ماہرین تعلیم کی ایک جماعت کے سپرد کیا جانا چاہیئے۔ مثلاً تین ارکان کی ایک مختصر کمیٹی جس کا یہ فرض ہوگا کہ ملک کے مختلف حصوں کا دَورہ کرے ہر مرکز پر مقامی ماہرین تعلیم و معاشیات سے مشورہ کرے اور اپنی رائے پیش کرے۔ اِس کمیٹی کا کام یہ بتلانا بھی ہوگا کہ کسی حد تک اور کن خاص مضامین میں مسلم اور غیر مسلم طلباء کے لئے ایک مشترکہ نصاب تیار کیا جا سکتا ہے اور کن مضامین میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ اور مستقل انتظام ضروری ہوگا۔ اِس امر کے متعلق رائے دینا بھی اِس کمیٹی کا فرض ہوگا کہ ایسے جُداگانہ

اِنتظام کو اطمینان بخش طریقہ پر زوبہ عمل لانے کے لئے آئینی تحفظ کس حد تک ضروری ہوگا۔

حاضرین! ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم کا مسئلہ خالص تعلیمی مسئلہ نہیں ہے۔ اگر آپ اِس مسئلہ پر مسلمانوں کی موجودہ زندگی کے پس منظر میں غور کریں تو یہ مسئلہ بجائے تعلیمی یا سیاسی ہونے کے زیادہ تر معاشی نظر آئیگا کیونکہ وہ تعلیم ناقص ہے جو ہم میں سے فلاکت زدہ افراد کی معاشی ترقی میں معاون ثابت نہ ہو۔ پس یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے معاشی ذرائع کے اِستحکام اور ہماری خیرات اور اوقاف کے مسئلہ پر توجہ کریں تاکہ اُن کو عامۃ المسلمین کی فلاح و بہبود کے لئے کام میں لایا جا سکے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ ذرائع نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔ آپ ملک کے مختلف حصوں میں مختلف اوقاف پائینگے جو قانون بیت المال کی غلط تعبیر کی وجہ سے یا تو مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے ہیں یا اُن کو حکومت نے ضبط کر لیا ہے۔ اور جہاں کہیں بھی یہ اوقاف مسلمانوں کے ہاتھ میں ہیں اُن کو دانشمندی سے اِستعمال نہیں کیا جا رہا ہے۔ اِس کے علاوہ زکوٰۃ کو ہم نے بری طرح فراموش کر دیا ہے۔ یہ ایک اولین فرض ہے جو اِسلام اُمراء پر عائد کرتا ہے تاکہ وہ غرباء کے ساتھ زندگی کے فوائد میں شریک رہیں اور احساس اتحاد و مساوات کا ثبوت دیں۔ اگر ہم اِسلام کے اس بنیادی حکم کے مطابق عمل کر سکیں تو مسلم عوام کی تعلیمی و معاشی سدھار کے اِسکیموں کو کامیابی

کے ساتھ چلانے کا مسئلہ بہت آسانی سے حل ہو جائیگا۔ اِس سلسلہ میں میں آپ کی مخلصانہ غور و فکر کے لئے اِس اسکیم کا ذکر کرتا ہوں جو مسلم کلچر سوسائٹی حیدرآباد نے بیت المال کے عظیم الشان اِدارہ کے احیاء کے لئے مرتب کی ہے۔ اگر یہ رو بہ عمل آجائے تو ہم اِس ملک میں ایک آزاد اور باعزت زندگی بسر کر سکتے ہیں

حاضرین۔ میں نے عمداً ان موضوعات کا ذکر کرنے سے گریز کیا ہے جو ہر سال آپ کی کانفرنس میں بحث وتمحیص کے لئے پیش ہوتے ہیں۔ میں نے صرف ایک اہم ترین مسئلہ پر اپنی توجہ مرتکز کی ہے یعنے ایک ایسی جامع تعلیمی اسکیم کا مرتب کرنا جو نسبتہً چھوٹے چھوٹے مسائل پر بھی حاوی ہو۔ اَب تک ہم نے اُن اسکیموں سے ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی جو دوسروں نے مرتب کر کے ہمارے سر تھوپا تھا۔ اَب وقت آگیا ہے کہ ہم خود اپنی ایک اسکیم تیار کرنیکی کوشش کریں اور یہ دیکھیں کہ ایسی اسکیم ملک کے تعلیمی نظام سے کس طرح ہم ربط و مطابقت پیدا کر سکتی ہے۔ ایک تحقیقاتی کمیٹی کی تشکیل کے لئے جو میں نے تجویز کی ہے یقیناً کچھ مصارف ناگزیر ہیں اور اگر آپ اِجازت دیں تو میں بخوشی یہ مصارف برداشت کرونگا۔ بقیہ امور میں میری دعاء ہے کہ آپ کے غور و فکر میں فضل الٰہی شریک رہے۔

اللہ اکبر

خطبۂ صدارت

آنریبل ابو القاسم فضل الحق

(وزیر اعظم و وزیر تعلیم حکومت بنگال)

صدر

مجلس استقبالیہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس۔ کلکتہ

منعقدہ

محمد علی پارک۔ کلکتہ

مورخہ ۲۹-۳۰-۳۱- دسمبر ۱۹۳۹ء

۷۸۶

اللہ اکبر

حضرات و خواتین محترم !

میں، مسلمانانِ بنگال کی طرف سے "آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اس ۵۲، سالہ سالانہ اجلاس کے تمام ممبروں، ڈیلی گیٹوں، اور وزیٹروں کے خیر مقدم کرنے میں خاص خوشی و مسرت محسوس کرتا ہوں۔ گذشتہ سال ۱۹۳۸ء کے اجلاس پٹنہ کی صدارت کرتے ہوئے خاکسار نے کانفرنس کے آئندہ اجلاس کو، بنگال میں منعقد کرنے کی دعوت دی تھی۔ اسٹینڈنگ کمیٹی، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ نے میری اس دعوت کو قبول کیا، اور ۱۲۔ نومبر ۱۹۳۹ء کو مسلم انسٹی ٹیوٹ، کلکتہ کے جلسہ میں یہ طے پایا کہ یہ اجلاس محمد علی پارک، کلکتہ میں ۲۹-۳۰-۳۱- دسمبر ۱۹۳۹ء کو منعقد کیا جائے۔ ضروری انتظامات کے لئے حسب معمول مجلس استقبالیہ قائم ہوئی اور اس قلیل عرصہ میں کانفرنس کو کامیاب بنانے کیلئے جو کوشش ممکن تھی وہ کی گئی۔ ہماری یہ تمنا ہے کہ کلکتہ کا یہ اجلاس ہر لحاظ سے کامیاب اور نتیجہ خیز ہو۔

ماضی، قریب، کی یاد

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ کا یہ بنگال میں چوتھا، کلکتہ میں تیسرا اور اس محمد علی پارک میں دوسرا اجلاس ہے۔ سب سے اول ۱۸۹۹ء میں اس کا اجلاس اسی کلکتہ میں ہوا جس کی صدارت فخر بنگال

و فخر ملت رائٹ آنریبل سید امیر علی بالقابہ رحمۃ اللہ نے فرمائی تھی۔ دوسرا اجلاس ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں ہوا جس کی صدارت، جسٹس سید شرف الدین مرحوم نے فرمائی تھی اور جس کے اصلی داعی اور روح رواں، نواب خواجہ سر سلیم اللہ بہادر مرحوم تھے۔ اس کانفرنس کو خاص اہمیت اس بنا پر حاصل ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد ڈھاکہ کے اسی پلاٹ فارم پر ڈالی گئی۔ جس میں نواب وقار الملک بہادر رح نواب محسن الملک بہادر مولینا محمد علی رح جیسے اکابر ملت شریک تھے، اور یہ خاکسار بھی اس کے خدام اولین کی صف میں کھڑا تھا۔ اس کانفرنس کا تیسرا اجلاس ۱۹۱۷ء میں اسی محمد علی پارک کے میدان میں منعقد ہوا تھا اس کے روح رواں، میرے مرحوم دوست، مولوی واحد حسین صاحب، ایڈوکیٹ ہائی کورٹ تھے، جو مسلم تعلیم کے بڑے خدمت گذار بزرگ تھے۔ اس اجلاس کی صدارت میرے دوست سر اکبر حیدری، نواب حیدر نواز جنگ بہادر موجودہ "صدر اعظم" باب حکومت" دولت اسلامیہ آصفیہ حیدرآباد دکن تھے۔

خاکسار ان تمام کانفرنسوں میں نہ صرف شریک رہا ہے بلکہ ہر طرح عملی خدمات انجام دیتا رہا ہے۔ بنا بریں میں آج اس کانفرنس کا بنگال کے دارالحکومت میں چوتھی دفعہ انعقاد پر خاص خوشی کا اظہار کرتا ہوں۔ اور ارکان کانفرنس، علی الخصوص سر سید علیہ الرحمۃ کے قافلہ کے سالار، ناخدائے تعلیم مسلمانان، حضرت مولنا حبیب الرحمن خان شروانی جناب نواب صدر یار جنگ بہادر کا خاص طور سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے اسلامیان بنگال کو یاد فرمایا اور اس احاطہ کے مسلمانوں کو دوسرے صوبوں کے مسلمانوں سے ملنے جلنے، تبادلۂ خیال کرنے اور بحیثیت مجموعی

اسلامی ہندوستان کے سود و بہبود پر غور کرنے کا موقع ہماری دعوت کو قبول فرماکر، عنایت کیا۔

برادران محترم و خواہران مکرم!

جہاں مجھ کو ماضی کے اس تذکرہ سے خوشی ہو رہی ہے وہاں ایک غم سے بھی دل متألم ہے۔ آج بنگال و ہندوستان کے ان بزرگان قوم کی صورتیں آنکھوں میں پھر رہی ہیں۔ جو کل تک اس کانفرنس کے آسمان کے آفتاب و ماہتاب، سیارے اور ستارے تھے اور جو افسوس کہ آج غروب ہو چکے ہیں گو ان کی پھیلائی ہوئی روشنی سے قوم کا حال روشن ہے اور مستقبل روشن تر ہوگا۔ خدا اُن کی محنتوں اور محبتوں کو قبول فرمائے اور ملت اسلامیہ کے جوانوں کو اُن کے ایثار، اخلاص، اخلاق اور سوزِ باطن سے زندہ کردے اور قوم کے لئے سب کچھ قربان کرکے کام کرنے کا ولولہ عطا فرمائے! آمین!!

کانفرنس کی گذشتہ تاریخوں کی یاد، ایک دوسری رنجدہ حقیقت بھی ہم پر روشن کر رہی ہے۔ آج سے تھوڑے عرصہ پہلے بنگال، باوجود اپنی تعلیمی پس ماندگی اور معاشی افلاس کے اسلامیان ہند کی بیداری و ترقی کی تحریک میں قائدانہ حصہ لے رہا تھا، جو اس سے ظاہر و باہر ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی بنا ڈھاکہ کے اجلاس ۱۹۰۶ء میں پڑی۔ اور اس کے بانیوں کی فہرست میں بنگال کے مسلم لیڈروں کے نام نہایت نمایاں ہیں۔ بنگال اُس گئے گذرے وقت میں بھی، اسلامی ہند سے پوری طرح مربوط تھا، بنگال کے تعلیم یافتہ مسلمان، اسلامیان ہند اور اسلامیان عالم کی تحریکات و ضروریات کی پوری طرح خبر رکھتے تھے۔

لیکن اس کا افسوس ہے کہ بعض کلچرل اسباب کے باعث یہ ربط و ضبط ذہنی و تعلیمی اعتبار سے کم سے کمتر اور کمزور سے کمزور تر ہوتا جا رہا ہے۔ آج ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ مسلمانان بنگال کا تعلیم یافتہ طبقہ، ذہنی اور فکری اعتبار سے دوسری صوبوں کے تعلیم یافتہ مسلمانوں سے ایک طرح سے منقطع ہو رہا ہے اور جو پرانی نسل کے بزرگ بنگال اور اسلامی ہند کے درمیان رابطہ قائم کئے ہوئی ہیں آہستہ آہستہ ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ انقلاب گذشتہ بتیس چالیس سال کے اندر کیسے اور کیونکر ظہور میں آیا اور کیونکر اس ذہنی و فکری بے ربطی کو ربط باہمی سے بدلا جا سکتا ہے اس کانفرنس کے سامنے ایک اہم مسئلہ ہے۔ خدا ہم لوگوں کو اس ذہنی خلیج کے پاٹنے اور رابطۂ قومیت کے استوار کرنے کی توفیق عطا فرمائے! آمین!!

جدید تاریخ ہند کا ایک باب زرّیں

لیکن میں آج غم انگیز تذکروں کو سنانے کے لئے کھڑا نہیں ہوا ہوں۔ بلکہ جدید اسلامی ہندوستان کی سب سے امید افزا و مسرت خیز تحریک پر ایک تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔ "علی گڈھ تحریک" غدر ۱۸۵۷ء کے بعد وہ واحد تحریک ہے جو عملی کارگذاری کے اعتبار سے، مسلمانان ہند کی سب سے کامیاب اور تعمیری آل انڈیا تحریک کہلا سکتی ہے۔ ہندی مسلمانوں کی کوئی دوسری منظم تحریک نہ اتنی طویل العمر ہے اور نہ اتنی کامیاب ہوئی ہے۔ اور اگر محض اس کی کامیابی پر غور کیا جائے تو بلا شبہ ہم اسکو نئے ہندوستان کی نئی تاریخ کا ایک زبردست باب زرّیں بیان کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔

قومیت اسلامیہ ہند کے مجدد اعظم، سید القوم، مسیحا رملت سرسید احمد رحمۃ اللہ علیہ نے علی گڈھ تحریک کو جاری کرنے اور مدرستہ العلوم علی گڈھ کی بنیاد رکھنے کے کچھ عرصہ بعد، ۱۸۸۶ء میں، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو قائم کی تھی۔ سرسید نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس اول میں، جو مولوی سمیع اللہ خاں صاحب بہادر سی۔ ایم۔ جی کی صدارت میں علی گڈھ میں بتاریخ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ دسمبر ۱۸۸۶ء میں منعقد ہوا تھا، سب سے پہلی تجویز اس آل انڈیا مجلس کی تاسیس کے متعلق پیش کرتے ہوئے جو تقریر کی تھی، وہ ایک اہم تاریخی سند ہے اور اسلامیان ہندوستان کی جدید قومیت و بیداری و ترقی کی تاریخ کے صفحۂ اول کہلانے کی مستحق ہے۔ اس تقریر سے غدر کے بعد مسلمانان ہند کی قومی پراگندگی تباہی و بربادی اور موجودہ ترقی اور حالت کے موازنے کا موقع ملیگا۔ اور یہ بھی معلوم ہوگا کہ ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ نے ہندوستان میں قومیت اسلام کی دوبارہ تعمیر و تجدید میں کتنا بڑا اور اہم پارٹ ادا کیا ہے اور ہم بحیثیت ایک ملت غدر ۱۸۵۷ء کے بعد کہاں اور کس پوزیشن پر تھے، اور آج ۱۹۳۹ء میں خدا کے فضل و عنایت اور سرسید اور قاسم رح جیسے جدید معماران قومیت اسلامیہ ہند کی روحانی فتوحات کی بدولت کہاں اور کس پوزیشن میں کھڑے ہیں۔؟ کدھر جا رہے ہیں اور کدھر جانا چاہیئے۔ ملت اسلامیہ ہند کی بحیثیت مجموعی ماضی قریب تھی، حال کیا ہے اور مستقبل کیا ہونا چاہیئے۔؟

قوم کا اس اجتماعی نظر سے اپنی مجموعی حالت کا احتساب کرنا ملی احساس "خودی" اور قومی شعور نفس کی بیداری کے لئے نہایت ضروری ہے

بلکہ تعمیر ملت کے لیئے "خود نگری" کی یہ شرط ایک لازمی شرط ہے۔

سر سید کی تاریخی تقریر

مجدد قومیت اسلامیہ ہند سر سید احمد رحمۃ اللہ نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی تاسیس کی تجویز پیش کرتے ہوئے ۱۸۸۶ء میں حسب ذیل تقریر فرمائی تھی:۔

"حضرات من! مجھے اس بات کی عزت دی گئی ہے کہ میں اس کانگریس میں جو قومی تعلیم پر غور کرنے کے لیئے جمع ہوئی ہے پہلا ریزولیشن پیش کروں اور وہ یہ ہے (ریزولیشن کی عبارت پڑھ کر فرمایا)

"اے صاحبو! مسلمانوں کی حالت کا تنزل اب اس درجہ کو پہنچ گیا ہے کہ تمام ہندوستان میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ نکلے گا جو اس کو تسلیم اور اس پر افسوس نہ کرتا ہو، ہماری حالت زار اب اس درجہ پہنچ گئی ہے کہ غیر قومیں بھی ہم پر آنسو بہاتی ہیں اور ہمارے بچوں کی تعلیم کے لیئے خیرات سے روپیہ جمع کرنے پر کوشش کرتی ہیں۔ بلا شبہہ ہم کو اپنے ان ہم وطن ہندو بھائیوں کا جنہوں نے صوبہ دکن میں ایسا ارادہ کیا شکر گذار ہونا لازم ہے مگر کیا ہماری قوم میں، جن کے اسلاف کے کارناموں کی شہرت دنیا کے ہر حصہ میں گونج رہی تھی اور جن کے سیف و قلم کی نام آوری کے نشان ہسٹری میں اور دنیا کے ایک بہت بڑے حصہ میں اب تک پائے جاتے ہیں،

اتنی غیرت اور ہمت بھی باقی نہیں رہی کہ اپنی قوم کی تباہ حالت کی درستی پر توجہ کریں۔

"اے صاحبو! جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ پولیٹیکل امور پر بحث کرنے سے ہماری قومی ترقی ہوگی۔ میں اس سے اتفاق نہیں کرتا بلکہ میں تعلیم کو اور صرف تعلیم ہی کو ذریعہ قومی ترقی کا سمجھتا ہوں۔ ہماری قوم کو اس وقت بجز ترقی تعلیم کے اور کسی چیز پر کوشش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہماری قوم میں تعلیم کی کافی ترقی ہو جائے گی تو ہم کو وہی کافی ذریعہ تنزل کی حالت سے نکلنے کا ہوگا۔ پس غور طلب یہی امر ہے کہ تعلیم کی ترقی کیونکر ہو؟ اس وقت ہمارا حال یہ ہے کہ گو ہم ایک قوم مسلمان کہلاتے ہیں مگر ایک جگہ کے رہنے والے دوسری جگہ کے رہنے والوں سے ایسے ہی ناواقف جیسے کوئی اجنبی قوم ایک دوسرے کے حال سے ناواقف ہو۔ ہم نہیں جانتے کہ پنجاب کے لوگوں کو اپنی قومی تعلیم اور قومی ترقی کی نسبت کیا خیال ہے اور انھوں نے کیا کیا ہے اور کیا کرنا چاہیئے پنجاب تو ایک دوسرا صوبہ ہے ہم اپنے صوبے کے ہی ایک ضلع کے رہنے والے دوسری ضلع کے رہنے والوں کے حال سے محض ناواقف ہیں۔ کوئی ذریعہ ہمارے پاس ایسا نہیں ہے کہ مختلف اضلاع کے لوگ کسی موقع پر آپس میں ایک جگہ جمع ہوں ایک کے حال سے دوسرے کو آگاہی ہو، ہم آپس میں ملکر اپنے خیالات جو قومی تعلیم اور قومی ترقی کی نسبت ہوں دوسروں پر ظاہر

کرسکیں ایک دوسرے کے خیالات سے تبادلہ ہو۔ جو غلطی ہمارے خیالات میں ہو وہ دوسروں کے خیالات سے بخوبی اصلاح پا دے۔ مختلف اضلاع کے لوگوں کے باہم جمع ہونے سے آپس میں واقفیت، آپس میں محبت اور اخلاص، باہمی ہمدردی اور یگانگت پیدا ہو۔ ہم باوجود ایک قوم مسلمان ہونے کے، جو بمنزلہ مختلف قوموں کے ہو رہے ہیں، ان میں قومی یگانگت بلکہ مجھ کو کہنا چاہئے کہ قومیت پیدا ہو۔ اس اجنبیّت نے ہم میں سے قومی ہمدردی کو مٹا دیا ہے۔ اس طرح پر باہم جمع ہونے سے قومی ہمدردی ہم میں پیدا ہو یا جس قدر ہے اس میں زیادہ ترقی ہو۔

انھیں خیالات سے یہ تجویز پیش کی ہے کہ ہر سال مسلمانوں کی تعلیم اور ترقی پر غور کرنے کے لئے مختلف مقامات و مختلف صوبجات کے لوگ ایک جگہ جمع ہوا کریں اور ایک صوبہ اور ضلع کے ذریعہ دوسرے صوبے اور ضلع کے مسلمانوں کو حالات معلوم ہوتے رہیں اور جو تدابیر ان کی بھلائی اور ترقی کی نسبت سوچی جاویں، ان پر بحث و مباحثہ ہو کر جو تدبیر عمدہ قرار پاوے وہ اختیار کی جائے۔" (تقریر سر سید احمدؒ ۱۸۸۶ء)

سر سیدؒ کی تقریر کا خلاصہ مطلب

اس تقریر سے مندرجۂ ذیل باتیں صاف اور روشن ہو جاتی ہیں:۔

۱۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی سیاسی و دنیاوی تباہی کا

یہ عالم تھا کہ سرسید رح کے الفاظ میں "غیر قومیں بھی ہم پر آنسو بہاتی تھیں" اور خیرات سے ہماری مدد کے لیے روپیہ جمع کرتی تھیں۔

۲۔ ایک صوبہ کے لوگ دوسرے صوبہ کے لوگوں سے ایک ضلع کے لوگ دوسرے ضلع کے لوگوں سے اور ایک شہر و قصبہ کے لوگ دوسرے لوگوں سے بے خبر، بے پرواہ اور بے تعلق تھے۔

۳۔ مسلمانانِ ہند نام کے ایک قوم تھے۔ قومیت اسلامیہ کے تمام رشتے ٹوٹ چکے تھے۔ قومی یکانگت اور ہمدردی کے احساسات عام تباہی کے سیلاب فنا میں مٹ چکے تھے۔ جغرافیائی اور ذہنی اجتماعی اور اخلاقی ہر اعتبار سے شیرازۂ ملت بکھر چکا تھا۔ انتشار و پراگندگی کی اس قیامت خیز پریشانی میں کوئی کسی کا پوچھنے والا نہ تھا۔ نفسی نفسی کا عالم تھا۔ قومیت اسلامیہ ہند کی بنیادیں ہل چکی تھیں، دیواریں گر چکی تھیں اور مسلمانوں کی ملت ورطۂ ہلاکت میں پڑی دم توڑ رہی تھی۔

تعمیر قومیت اسلامیہ ہند کی تحریک

یہ مایوس کن حالات تھے کہ مسیحا قوم سرسید رح اللہ کا نام لے کر اٹھے اور قومیت اسلامیہ ہند کے صور کو علی گڑھ سے پھونکا اور مسلمانوں کو زمانے کے خطرات سے بچاتے ہوئے تعلیم و ترقی کی راہ پر لگایا۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی اور ملت کے لائق ترین دردمندوں، عالموں، واعظوں، شاعروں، لکچراروں اور معلموں کو ایک پلاٹ فارم پر جمع کر دیا۔ اور پھر ہندوستان کے مختلف صوبوں اور شہروں میں اس کی سالانہ کانفرنسیں کرنے کا انتظام کیا، خاص اخبارات اور رسائل نکالے، زبردست قومی

واسلامی لٹریچر پیدا کیا مسلمانوں کی حالت کا صحیح اندازہ کرنے کیلئے کانفرنس کے اجلاسوں کے موقعوں پر مختلف صوبوں اور ضلعوں کے مسلمانوں کے حالات پر اعداد و شمار کی رپورٹیں جمع کروائیں اور سارے ہندوستان کے مسلمانوں میں عام تعلیم و ترقی کی تحریک جاری کی اور اُن کی سوئی ہوئی قومیت کے احساس کو بیدار کیا۔

اس مردِ خود آگاہ، خدا دوست و ملت شناس کی علی گڑھ تحریک نے پورے اسلامی ہندوستان اور برما کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ حتیٰ کہ صوبہ سرحد و پنجاب و سندھ سے لے کر رنگون اور تقلیبر سے لیکر الٰہ آباد اور مدراس اور برطانوی ہند سے ریاستی ہند تک اسکی آواز بازگشت پہنچی، اور دو کی تحریک پیدا ہوئی اور ایک انقلاب عظیم رونما ہوا۔

علی گڑھ کانفرنس کی تاریخی خدمات

الغرض آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس غدر ۱۸۵۷ء کے بعد اسلامیان ہند کی سب سے پہلی اجتماعی تنظیم و تحریک ہے، جس کو مسیحائے قوم، معمار ملت سر سید احمد رحمۃ اللہ نے ۱۸۸۶ء میں جاری کی۔ آج دسمبر ۱۹۳۹ء میں اس کانفرنس کی عمر باون سال کی ہو گئی ہے۔ غدر کے بعد مسلمانان ہند تباہ و برباد ہو چکے تھے، اُن کی حکومت و ریاست ختم ہو چکی تھی، اُن کا شیرازہ ملت پریشان ہو چکا تھا، ان کا نظام تعلیم درہم و برہم ہو گیا تھا، اور بحیثیت ایک مستقل جماعتی ہستی اور قومیت کے اُن کا وجود فنا ہونے کے قریب تھا۔ ایسے نازک وقت میں یہ سر سید علیہ رحمۃ ہی کی کوہ وقار شخصیت اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کی زبردست اصلاحی

تحریک تھی، جس نے مسلمانوں کو زمانے کے انقلابی خطرات اور نشیب و فراز سے بچاتے ہوئے، تعلیم و ترقی اور تعمیرِ قومیت کی راہ جدید پر لگایا اور مسلمانوں کے اندر ذہنی و جماعتی حیثیت سے ایک نئی روح زندگی پیدا کی۔ جس کا نتیجہ ہم آج اسلامیان ہندوستان کی، ہر میدان میں بیداری، و ترقی اور ایک عمومی نشاۃ الجدیدہ کی صورت میں دیکھ رہے ہیں۔ بلاشک و شبہہ مسلمانانِ ہند کی اس نشاۃ الجدیدہ میں علی گڈھ کی تحریک کا نمایاں ترین حصّہ ہے۔

شاہوں اور فقیروں کی زیارت گاہ

سرسیدؒ نے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ۱۸۸۶ء میں علی گڈھ میں رکھی تھی اور اس کا مقصد مسلمانوں میں جدید مغربی علوم و فنون کی اسلامی روایات کے ساتھ اشاعت، علوم اسلامیہ کی تحقیق جدید اور مسلمانوں کی اصلاح و ترقی کی کوشش قرار دیا تھا۔ ۱۸۸۶ء کے بعد اس کا سالانہ اجلاس ہندوستان کے مختلف صوبوں اور شہروں میں ہوتا رہا۔ اس کی صوبائی شاخیں ملک میں قائم ہوئیں اس کی سعی سے علی گڈھ اسلامیان ہند کا بہت جلد ذہنی مرکز بن گیا۔ جس کی زیارت کو ملک معظم جارج پنجم شہنشاہ برطانیہ اور امیر حبیب اللہ شاہ افغانستان جیسے شاہوں اور شہنشاہوں نے بھی ضروری خیال کیا اور ملّت کا کھویا ہوا اعتبار و وقار بحال ہوا۔ اس کی کانفرنسوں میں والیان ریاست اور گورنرز سے لے کر عام مسلمان سب یکساں شریک ہوتے رہے اور یہ اس کی نصف صدی کی مسلسل و متواتر جدوجہد اور تحریکات کا نتیجہ ہے کہ مسلمانانِ ہند ۱۸۸۶ء کے

مقابلے میں آج اپنے جسم ملت میں بہت زیادہ استقلال و طاقت محسوس کر رہے ہیں اور ہر میدان میں ترقی کر رہے ہیں اور آج اپنی قومیت اسلامی کی جڑوں اور بنیادوں کو زمینِ ہندوستان میں مستحکم و مضبوط پاتے ہیں۔ اور علوم و فنون جدیدہ کے اسلحہ سے مسلح ہو کر انقلابات زمانہ کے مقابلے کے لائق ہیں۔ اگر علی گڈھ تحریک پیدا نہ ہوتی تو موجودہ پُر فتن انقلابی دور میں مسلمانوں کا خدا ہی حافظ تھا۔

چند تعمیری خدمات کے عنواناتِ جلی

دسمبر ۱۹۰۶ء تک اسلامیانِ ہندوستان کا واحد آل انڈیا جماعتی پلاٹ فارم آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا پلاٹ فارم تھا۔ اسی پر تمام ہمدردانِ قوم بلا تفریق صوبائیت، و فرقہ بندی، نسل و قبیلہ بحیثیت مسلمان جمع ہو کر ملت کی ترقی و اصلاح کی تجاویز پر غور کرتے تھے اور تمام مسلمانوں کی جماعتی رہنمائی کا فرض ادا کرتے تھے۔ اس کی خدمات کا اندازہ کرنے کے لیے یہ کہنا کافی ہے کہ ۱۸۸۶ء میں جبکہ یہ تحریک شروع ہوئی کل ہندوستان میں صرف ۴۴ مسلمان تھے جو اعلیٰ انگریزی تعلیم پا رہے تھے اور ان میں بیس علی گڈھ میں تھے۔ اور آج اسی علی گڈھ تحریک کا نتیجہ ہے کہ:-

۱- علی گڈھ مسلم یونیورسٹی قائم ہو چکی ہے، جو اپنی نوعیت کی سارے ایشیا اور مشرق میں مرکزی اقامتی یونیورسٹی ہے۔ اس پر یہ کانفرنس اور مسلمانانِ ہند جتنا فخر کریں کم ہے۔

۲- علی گڑھ میں خاص مسلم خواتین کے لئے ڈگری کالج قائم ہو چکا ہے۔

۳- اسلامیہ اسکولوں، مسلم ہوسٹلوں، مکتبوں اور تعلیمی و علمی سوسائٹیوں کا نظام کم و بیش سارے ملک میں قائم ہو چکا ہے اور جدید مغربی تعلیم سے تعصبات مٹ چکے ہیں۔

۴- اکثر صوبوں میں مسلم کالجوں کی بنیاد پڑ چکی ہے۔

۵- اسی علی گڑھ تحریک نے جدید اردو کو جنم دیا ہے۔ انجمن ترقی اُردو جس نے اردو کی عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں اصلاً ایجوکیشنل کانفرنس کا ہی ایک شعبہ تھی۔ اور سر سید جدید اُردو نثر کے ابوالآبا اور مولانا حالی جدید قومی اُردو شاعری کے استاد اول تھے۔ جدید اردو قومی صحافت کی بنیاد بھی علی گڑھ ہی میں پڑی ہے۔ اور یہ سب تحریک علی گڑھ کی برکت ہے۔

۶- عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے قیام میں علی گڑھ کی تحریک اُردو کا سب سے نمایاں حصہ ہے، یہانتک کہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر علی گڑھ نہ ہوتا تو جامعہ عثمانیہ بھی نہ ہوتا۔

۷- یونانی طب کی، جو دراصل اسلامی و عربی طب ہے، اسی پلیٹ فارم سے اصلاح و تجدید کی تحریک شروع ہوئی جسکا نتیجہ آج طبیہ کالج علی گڑھ طبیہ کالج دہلی اور طبیہ کالج حیدرآباد ہیں۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں علی گڑھ کانفرنس اور تحریک کے ایک بڑے زبردست لیڈر تھے۔

۸- جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی بنیاد رکھنے والے بھی علی گڑھ ہی کے فرزند تھے۔

۹- دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، جو مدارس عربیہ کی تجدید و اصلاح کی تحریک کا ایک مرکز ہے علی گڑھ ہی کے ایک جامع علوم شرقیہ و غربیہ عالم

اور پروفیسر کی مساعی کا نتیجہ ہے۔ یہ دار العلوم مدارس اسلامیہ میں جدید مغربی علوم کی ترویج اور علوم اسلامیہ کی نئے اصول تحقیقات کے مطابق اشاعت میں کوشاں ہے۔

۱۰- اسی کانفرنس اور اس کی شاخوں اور لیڈروں کی کوشش اور مسلسل جدوجہد سے مختلف صوبوں میں خاص مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات اور مشکلات کو حل کرنے کے لیے جداگانہ تعلیمی اسکیمیں جاری ہوئیں جن کے ماتحت انگریزی تعلیم کے پہلو بہ پہلو اسلامی دینیات ادب و تاریخ و تہذیب کی تعلیم لازمی کی گئی۔ یوپی میں مسلم اسکیم اور بنگال میں نیو مدرسہ اسکیم اس کی مثالیں ہیں۔

۱۱- علی گڑھ تحریک کے لیڈر اپنے زمانے میں مسلمانان ہند کے مسلمہ لیڈر تھے اور مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کے جاری کرنے والے تھے۔ یہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہی کا اجلاس ڈھاکہ (دسمبر ۱۹۰۶ء) تھا جہاں آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد پڑی تھی۔ اس طرح مسلم لیگ حقیقت میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا بچہ ہے، اور اسی کے پلاٹ فارم پر اس کی پیدائش ہوئی ہے۔

۱۲- اس علی گڑھ تحریک نے اسلامی ہند کو وقار الملک، محسن الملک عماد الملک، حالی و شبلی اور سب سے آخر لیکن سب سے اہم علی برادران جیسے ملت کے عاشق و مجاہد لیڈر عطا کئے جنھوں نے مسلمانان ہند کی جدید قومیت کی تعمیر میں تاریخی حصہ لیا ہے۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد اسلامیان ہند کا ملی شیرازہ بکھر گیا تھا۔ اجتماعی رابطے کا رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ حیات قومی کا قوام بگڑ گیا تھا۔ ملت

اسلامیۂ ہند، اپنی ملی زندگی کے ماضی، حال و مستقبل کے جماعتی تصور اور اپنی مجموعی زندگی کے جماعتی شعور سے محروم ہو چکی تھی۔ ایسے نازک ترین حالات میں یہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کی تحریک تھی جس نے گذشتہ نصف صدی کے دوران میں مسلمانان ہند کی اجتماعی زندگی کی روایات کو تواتر و تسلسل کے ساتھ قائم رکھا اور مستحکم کیا۔

نئے انقلابی حالات اور اُس کی ضروریات

مسلمانان ہند کی سب سے زیادہ عمر اور ٹھوس خدمات رکھنے والی قومی مجلس، یہی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ ہے۔ سلطنت مغلیہ کے خاتمہ کے بعد مسلمانان ہند کی اگر کوئی تحریک تواتر و تسلسل اور عملی کامیابی کے ساتھ گذشتہ نصف صدی سے جاری رہی ہے، تو وہ علی گڑھ تحریک ہے جس نے ملت اسلامیۂ ہند کے تن فسردہ میں ایک نئی جان ڈالی ہے لیکن سوراج، آزادی، جمہوریت اور اشتراکیت اور مادّیت جیسی جدید تحریکات کے مدنظر اس کانفرنس کو پہلے سے بھی زیادہ نازک اور انقلابی حالات کا مقابلہ کرنا، نئے نئے تعلیمی مسائل حل کرنا اور نئے نئے تمدنی مہمات سر کرنا ہے اور بنابریں اس کی ضرورت آج پہلے سے بھی زیادہ ہے۔

مسلم تعلیم و تمدن کو نئے خطرات

آج اللہ کے فضل سے، مسلمانان ہند میں آل انڈیا وحدت اور تنظیم موجود ہے۔ نواب سر محمد مزمل اللہ خاں رحمۃ اللہ نے اپنے خطبہ استقبالیہ

اجلاس جو بھی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۳۷ء میں تحریر فرمایا تھا:-
"جسطرح مسلمانوں کیلئے ایک پولیٹیکل کانفرنس یا مسلم لیگ کی ضرورت ہے اسیطرح ایک ایجوکیشنل کانفرنس کی ضرورت ہے" آج ہندوستان میں ایسی منظم جماعتیں پیدا ہو چکی ہیں جو اپنے مخصوص طریقہ تعلیم مخصوص طریقہ فکر و عمل اور مخصوص طریقہ تمدن کو خاص تعلیمی اسکیموں اور گورنمنٹ کا ونسل اور قانون کی قوتوں کے ذریعہ مسلمانوں اور دوسری جماعتوں پر مسلط کرنے کے لئے منظم کوشش کر رہی ہیں۔ اندریں حالات نہایت ضروری ہے کہ آل انڈیا بنیاد اور ہندوستان گیر اساس پر، ایک متحدہ نصب العین اور پالیسی ملت اسلامیہ ہند کے تعلیمی و تمدنی استقلال کے متعلق اختیار کی جائے اور مسلمانوں کی کلچرل انفرادیت، اور ملی شخصیت کو تعلیم و تمدن کے دائرہ میں آزاد و محفوظ رکھنے کے لئے ایک ایسا پروگرام طے کیا جائے جس کے جاری کرنے میں بنگال و آسام اور پنجاب، سرحد و سندھ کی برسراقتدار مسلمان اکثریتیں بھی شریک ہوں اور یو۔ پی، بہار، بمبئی، و مدراس کی مسلمان اقلیتیں بھی اس میں حصہ لیں تاکہ جس طرح آل انڈیا مسلم لیگ ایک متحدہ نصب العین اور پروگرام کے ساتھ مسلمانان ہند کی سیاسی آزادی و ترقی کے لئے کوشاں ہے اسی طرح آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ایک متحدہ نصب العین، اور پروگرام کے مطابق، تعلیم و تمدن، کلچر اور تہذیب کے میدان میں مسلم انڈیا کی خود مختاری کو قائم کرنے کی جدوجہد کرے اور اس کام میں اکثریت کے صوبے اقلیت کے صوبوں کے ساتھ معاونت کریں اور تمام ہندوستان کے مسلمان ایک دوسرے کے تعلیمی مشکلات، موانع، اور مسائل سے واقف ہوں، اور اُن کے نمایندے سال میں ایک دفعہ ایک مقام پر جمع ہو کر اپنے گذشتہ پر ریویو کریں، موجودہ حالات کا

جائزہ لیں اور آیندہ کے لئے تدابیر سوچیں اور عمل میں لائیں۔ ملت اسلامیہ ہند کے لئے سیاسی آزادی و خود مختاری جتنا ضروری ہے اتنا ہی بلکہ اس سے زیادہ تعلیمی آزادی و تمدنی خود مختاری (Cultural Autonomy) لازمی ہے۔ کیونکہ سیاسی آزادی کھو کر قوم زندہ رہ سکتی ہے لیکن تعلیمی و تمدنی خود مختاریت گوا کر ملت زندہ نہیں رہ سکتی ہے، ملت نام ہے ملّی روایات کا اور قوم عبارت ہے قومی کلچر سے۔

بنا بریں آج اسلامیان ہند کو ہندوستان میں اپنی قومیت کے استحکام اور حقوق و مفاد کی حفاظت و ترقی کے لئے، پہلے سے زیادہ ضروری ہے کہ وہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی اس نظم کو جس کی بنیاد سر سید احمد رحمۃ اللہ کے مبارک ہاتھوں نے علی گڑھ میں رکھی تھی قائم رکھیں، بلکہ جدید انقلابی حالات کے مقابلہ کے لئے زیادہ مستحکم کریں اور ہر طرح سے اس کو اسلامی تعلیم، اسلامی کلچر اور اسلامی تمدن و تہذیب کے استقلال کی حفاظت کرنے کے لائق بنائیں۔

ایجوکیشنل کانفرنس کے بنیادی مقاصد

حضرات و خواتین!

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس اول منعقدہ علی گڑھ مورخہ ۲۷-۲۸-۲۹- دسمبر ۱۸۸۶ء میں کانفرنس کے مندرجہ ذیل اغراض و مقاصد مقرر کئے گئے تھے:-

۱- مسلمانوں میں یورپین علوم و فنون اور اعلیٰ جدید تعلیم کی اشاعت کرنا اور ان کے خلاف بے جا تعصبات کو مٹانا۔

۲- انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں، مسلمانوں کی مذہبی تعلیم اور کلچرل ضروریات و روایات کو پورا کرنے کی تدابیر اختیار کرنا۔

۳- علوم مشرقی و اسلامیات کی اعلیٰ تعلیم کی حفاظت و ترقی کی کوشش کرنا۔

۴- قدیم مکتب سسٹم کی اصلاح، ترقی و حفاظت کی کوشش کرنا اور ان کے ذریعہ عام ابتدائی تعلیم کی ترویج کرنا۔

۵- قرآن اسکولوں کی حفاظت و ترقی اور قرآن پاک کے حفظ کرنے کے طریقہ کی جس میں تنزل ہوگیا ہے، تجدید کرنا۔

خدا کا شکر ہے کہ مغربی تعلیم کے خلاف تعصب، جو علی گڑھ تحریک کی ابتدا میں نہایت سخت اور عام تھا، اب دور ہو چکا ہے، مغربی علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم مسلمانوں میں پھیل چکی ہے اور پھیلتی جارہی ہے۔ لارڈ میکالے کے جاری کردہ نظام تعلیم کے مطابق اس کا خطرہ پیدا ہوا تھا کہ اسکولوں اور کالجوں سے مسلمانوں کی قدیم قومی و مذہبی ادبیات کا خاتمہ ہوجائیگا لیکن یہ علی گڑھ تحریک ہی کی برکت ہے کہ آج انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں عربی، فارسی، اردو زبان وادبیات کی تعلیم کا انتظام، ملک کے تعلیمی نظام کا ایک جزء قرار پاچکا ہے، کسی قدر دینیات کی تعلیم کا اہتمام بھی ابتدائی اسکولوں میں کیا گیا ہے، لیکن ابھی اس کے لئے بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ علوم مشرقی اور دینیات کی اعلیٰ تعلیم کا اہتمام خاص مدارس عربیہ و اسلامیہ کے علاوہ علی گڑھ، پٹنہ، الہ آباد، لکھنؤ لاہور حیدرآباد اور ڈھاکہ کی یونیورسٹیوں کے اندر خاص نصابوں، ڈگری کورسوں، اور سندات و امتحانات کے ذریعہ بھی کیا جارہا ہے، لیکن اس کے لئے ابتک جو کچھ ہوا ہے وہ علوم اسلامیہ کی عظمت و اہمیت کے پیش نظر بہت کم ہوا ہے۔ اور بعض موانع و مشکلات کے باعث، کلکتہ

یونیورسٹی میں، جو ہندوستان کے سب سے بڑے اسلامی صوبے کے دارالحکومت کی یونیورسٹی ہے اب تک اس کے لئے اتنا بھی نہیں ہوا ہے جتنا کہ پٹنہ، الہ آباد اور لکھنؤ کی یونیورسٹیوں میں ہو چکا ہے۔ قدیم مکتب سسٹم کی اصلاح و تجدید کے لئے سارے ملک میں کچھ نہ کچھ کیا گیا ہے جس کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ انگریزی دورِ حکومت کی ابتدا میں لارڈ میکالے کی جاری کردہ مغربی تعلیم کے نظام کے ماتحت اس کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ قدیم مکتب سسٹم بالکل فنا ہو جائیگا، لیکن علی گڈھ تحریک کے ماتحت مسلمانوں کی متواتر جد و جہد سے بالآخر مکتب سسٹم فنا کے خطرہ سے نکل گیا، اسکی اصلاح کے لئے اتنا کیا گیا کہ قرآن و دینیات کی ابتدائی تعلیم کے ساتھ ساتھ، پرائمری اسکولوں کے مروجہ نصاب اور مضامین کو پہلو بہ پہلو پیوند دینے کی سعی کی گئی، نئے مضامین کی درآمد سے قدیم مکتبی نظام کے اندر ایک نئی جان پڑ گئی، مکتبوں کے لئے مولوی ٹریننگ اسکولوں کا نظام بھی علی گڑھ کانفرنس کے مسلسل مطالبات سے قائم ہوا، اور سرکاری اسکولوں میں مسلمان اُستادوں کی تعداد بھی بڑھائی گئی۔ حفظ قرآن کا رواج زندہ ہوا، خالص مذہبی مدارس کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ ہزاروں حافظ قرآن، سیکڑوں علماء دین اور گریجوئیٹ پیدا ہوئے۔

الغرض جن مقاصد کے لئے ایجوکیشنل کانفرنس قائم ہوئی تھی اور جن اغراض کا اعلان، اس کے اجلاس اول میں کیا گیا تھا، علی گڑھ کانفرنس اُس میں کم و بیش کامیاب ہوئی، لیکن علم اور فن ایک ہمیشہ ترقی کرنے والی چیز ہے، جوں جوں مسلمانوں نے نئے علوم میں ترقی حاصل کی، نئے علوم و فنون کے دائرے بھی وسیع سے وسیع تر ہوتے چلے گئے، بنابریں گو آج

مسلمانوں کی تعلیمی حالت پہلے سے بدرجہا بہتر ہے لیکن دیگر اقوام ہند کے مقابلے میں کیا اعتبار تناسب خواندگی اور کیا باعتبار تناسب تحصیل اعلیٰ تعلیم اور کیا باعتبار مہارت فنون جدیدہ اور کیا باعتبار معاشی خوشحالی، مسلمانان ہند اب بھی پس ماندہ ہیں اور اگر وہ زندگی کے میدان میں دوسری جماعتوں سے بازی لے جانا چاہتے ہیں تو ان کا فرض ہے کہ وہ پہلے سے زیادہ جوش و خروش، استقلال و محنت کے ساتھ، علوم و فنون حاضرہ میں مہارت تامہ حاصل کرنے کی کوشش کریں اور کسی علم، کسی فن اور کسی صنعت میں کسی قوم سے پیچھے نہ رہیں، بلکہ اپنے قابل فخر اسلاف کرام کی طرح جو عصر حاضر کے اصلی معلمین اولین تھے، اقوام عالم کے امام و پیشوا بننے کی کوشش کریں۔

واردھا اسکیم

عام جبری تعلیم کو رواج دینے کی اسکیم اپنی انوکھی ندرت کے باعث ملک کی توجہ کا مرکز بن گیا ہے وہ واردھا اسکیم ہے جس کے اصلی مصنف مسٹر گاندھی ہیں لیکن جس کے ایڈیٹر اور مؤلف ڈاکٹر ذاکر حسین خاں اور گاندھی جی کی منظور کردہ تعلیمی کمیٹی ہے۔ میں گذشتہ سال اجلاس پٹنہ کے خطبۂ صدارت میں واردھا اسکیم کے متعلق اپنے خیالات نہایت صفائی سے عرض کر چکا ہوں، میں اپنی رائے پر اب بھی قائم ہوں۔ جہانتک ابتدائی تعلیم کے عام رواج دینے کے مقصد کا تعلق ہے میں اور ہر مسلمان اس کا حامی ہے، لیکن میں نہیں چاہتا کہ اس کوشش میں ملک موجودہ دور حضارت سے ترقی معکوس کرتے ہوئے بندروں کے عہد غیر میمون میں واپس جائے۔ مجھ کو واردھا اسکیم میں رہبانیت اور گاندھیت کی صاف جھلک معلوم ہوتی ہے

بلکہ علانیہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وارِدھا ایک نئے مذہب کا قبلہ ہے اور وارِدھا اسکیم اس نئے مذہب کی عام ترویج و اشاعت کی ایک ترکیب ہے۔ گاندھیت کو دیہات سدھار اسکیم کے نصاب تعلیم میں داخل کر کے اور اہنسا اور ستیہ گرہ دھرم کی تعلیم کو اخلاقیات کی تعلیم کا اصل الاصول قرار دے کر صاف اور کھلے طور پر، مسلمان بچوں کو مُرتد بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک طرف مسٹر گاندھی نے مذہبی تعلیم کو نصاب تعلیم سے یہ کہہ کر نکالنے کی حمایت کی ہے کہ اس سے بین الاقوامی منافرت بڑھتی ہے اور دوسری طرف اپنے نو ایجاد مذہب "اہنسا دھرم" اور "ستیہ گرہ دھرم" کی تعلیم کو وارِدھا اسکیم کی عملی تعلیم کی بنیاد بنایا ہے۔ مَیں ملت اسلامیہ ہند کی طرف سے یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمان ایک لمحہ کے لیے کسی ایسے ابتدائی نظام تعلیم کو برداشت نہیں کر سکتے ہیں جس کی بنیاد اسلامی دینیات اور اسلامی روایات پر نہیں رکھی گئی ہو اور جس کی زبان اور رسم الخط، مسلمانوں کی منظور کردہ نہ ہو اور جس کے اہتمام و انصرام کے اندر مسلمانوں کو پوری طاقت اور نیابت حاصل نہ ہو۔ مسلمان اپنی تعلیم و تمدن کی آزادی و خود مختاری کو کسی جبری اور رفری تعلیمی نظام سے کسی قیمت پر خریدنے اور بدلنے کو تیار نہیں ہوں گے۔ اسلامی تعلیم، علوم اسلامیہ، فنون ملیہ، اور تہذیب قومیہ کی آزادی و ترقی ہمارا مقصد اور ہمارا نصب العین ہے۔

وارِدھا اسکیم، قطع نظر کلچرل، ٹیکنیکل، اور مالی دشواریوں اور کمزوریوں کے بنیادی طور پر اس لئے غلط ہے کہ وہ عام اور رفری جبری ابتدائی تعلیم کے دلکش اور پر فریب نام سے قانون و حکومت کی قوت قاہرہ کے زور سے عام باشندگان ہند کو ہندوازم کی نئی صورت کے رنگ میں

رنگنا چاہتا ہے۔ ہندو ازم کی اس نئی صورت کا نام گاندھی ازم یا مذہب گاندھیت ہے۔ جو طالسطائی کی عیسائیت، منو کے ورن آشرم دھرم، کرشن کی گیتا، اور جین ازم کے اہنسا کا معجون غیر مرکب ہے اور جس کو ستیہ گرہ دھرما کے نئے نام سے معنون کیا گیا ہے۔ یہ ایک نئے ہندو تمدن کی تعمیر کے خواب کی تعبیر ہے لیکن ہندوستان میں جبتک اسلام کا علم سربلند ہے یہ خواب بے تعبیر رہے گا۔ یہ ملک کو پانچہزار سال قبل کے عہد رام راج کی طرف لوٹا دینے والی رجعت پسندانہ اسکیم ہے۔ جو خالص گاندھیت اور ہندو نیشنل ازم کے مذہب جدید پر مبنی ہے۔ واردھا اسکیم کی یہ تعلیم کہ ہر مذہب سچا ہے اور کسی مذہب کو دوسرے مذہب پر فضیلت و فوقیت حاصل نہیں ہے اسلام کی نفی ہے

مختلف ہندو ریاستوں اور کانگریسی وزارتوں کے ماتحت جس منظم طریقہ سے مسلم تعلیم، زبان، رسم الخط، تعلیمی ادارات و روایات کے خلاف مخالفانہ و معاندانہ کارروائیاں کی گئیں ہیں۔ اس سے یہ صاف طور پر کھل گیا ہے کہ اکثریت کی ایک برسر اقتدار پارٹی ملت اسلامیہ کے مذہبی و ملی استقلال شخصی کو مٹانے کے درپے ہے۔ اور سرسید علیہ رحمۃ نے ۱۸۶۷ء میں جو پیشین گوئی کی تھی، موجودہ ہندوستان میں گاندھی۔ اور مالوی پارٹی کے زیر اثر حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی ہے۔ شمس العلماء مولنا الطاف حسین حالی مرحوم لکھتے ہیں

سرسید احمد کی پیشین گوئی

"۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہانتک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں اردو زبان اور فارسی رسم الخط کے موقوف کرانے میں کوشش کی جائے

اور بجائے اُس کے بھاشا زبان رائج ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے۔

"سر سیدؒ کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جبکہ مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔"

سر سید احمد علیہ رحمۃ خود لکھتے ہیں:-

"انھیں دنوں میں جبکہ ہندی دیوناگری کا یہ چرچا بنارس میں پھیلا، ایک روز مسٹر شکسپیر سے، جو اُس وقت بنارس میں کمشنر تھے، میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سُن رہے تھے۔ آخر انھوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے۔ اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔ میں نے کہا کہ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہیں ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد اُن لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں، بڑھتا نظر آتا ہے، جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔ مسٹر شکسپیر نے کہا کہ اگر آپ کی پیشین گوئی صحیح ہو تو نہایت افسوس ہے۔ میں نے کہا مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔"

ہندو تمدنی و تعلیمی فسطائیت کا ہولناک تجربہ اور لیگ

آج کون ہے جو سر سید اعظم کی اس پیشین گوئی کی صداقت پر شک لا سکتا ہے۔ آج جس طرح اردو کو مٹانے، مسخ کرنے، اور اس کی جگہ

ایک مصنوعی جناتی زبان نزاد سے اور قانون و حکومت کے زور سے جبراً جاری کرنے کی کوشش کی جاری ہے وہ اس مجلس کے تمام حاضرین و حاضرات پر روشن ہے۔ "ہندی اٹھوا ہندوستانی" اور ہندی پرچار اور دیوناگری پرچار کی تحریکات کی تہ میں ایک طرف ہندو تمدن اور ہندو سامراج کے احیا کرنے کی آرزو کام کر رہی ہے اور دوسری ہندوستان کے عہد اسلامی کے تمام اسلامی آثار و نشانات کو مٹانے اور ہندو کلچر فسطائیت کو مسلط کرنے کا نصب العین کارفرما ہے انھیں مخالف اسلام قوتوں کی سازش کا نتیجہ تھا کہ سابق مہاراجہ الور نے سرکاری احکام کے ذریعہ، اپنی ریاست میں ہندی زبان اور ناگری خط کو جبراً سب پر مسلط کرنے کی پالیسی اختیار کی تھی۔ تمام مکاتب و مدارس کو بند کر دیا تھا، اور فارسی و اردو رسم الخط کے استعمال کو اپنی حدود ریاست میں خلاف قانون ہونے کا اعلان کیا تھا۔ مہاراجہ الور کو الہ آباد اتحاد کانفرنس ۱۹۳۲ء میں سفیر اتحاد کی حیثیت سے خیر مقدم کیا گیا تھا، اور کانگرسی و مہاسبھائی ہنود نے اُن کو "راج رشی" کے لقب سے ملقب کیا تھا۔ راج رشی موصوف کا نظریۂ اتحاد بالکل ہندو فسطائیت کا نظریہ تھا جس کے ماتحت کسی غیر ہندو جماعت کو اپنی علٰحدہ زبان، رسم الخط، نظام تعلیم و نظام معاشرت کے استقلال کو بحال و برقرار رکھنے کا حق حاصل نہیں ہوگا، بلکہ ہر ملت کو ہندو ازم کے رنگ میں رنگین ہونا، اور ہندوؤں کی زبان بولنا اُونچ جاتی کے ہندوؤں کی تہذیب اختیار کرنا اور اُن کی سیاست کا آلہ کار بننا لازم ہوگا۔

آپ حضرات کو معلوم ہے کہ الور کے راج رشی کے اس ہندو فسطائیت کے خواب کی کیسی دردناک و حسرتناک تعبیر ہوئی۔ بہادر میواتی مسلمانوں نے اپنی مذہبی تعلیم، اردو زبان، اور اردو رسم الخط کی آزادی کی خاطر ریاست کی

طاقتوں کے مقابلے میں زبردست اور کامیاب جنگ کی۔ ہزاروں مسلمانوں نے ہجرت اختیار کی۔ گھربار، اور وطن عزیز کی قربانی پیش کی۔ بہت سی مسلمانوں نے اس سے بھی زیادہ اپنی جانوں کی قربانیاں پیش کیں، اور ریاست الور کا تختہ اور اس کی فسطائی کانگریسی پالیسی کو اُلٹ کر دم لیا"۔ راج رشی کو ریاست چھوڑنا اور ولایت میں بے وطنی کی موت مرنا پڑا۔"انقلاب حکومت" کا واقعہ پیش آیا۔ اسلامی مکاتب و مدارس و مساجد کی آزادیاں بحال ہوئیں، اردو زبان و رسم خط کی تعلیم پر سے تمام پابندیاں اُٹھا دی گئیں۔ اور مسلمانوں کو ایک آزاد و مستقل ملت کی حیثیت سے نظام سلطنت میں تسلیم کیا گیا۔ -

حضرات محترم!

الور کے گذشتہ "انقلاب حکومت" کے واقعہ میں نہ صرف سرسید رح کی پیشین گوئی کی تصدیق ہے، بلکہ ہندوستان کے محبان وطن کیلئے ایک زبردست تنبیہ بھی ہے۔ الور نے یہ صاف دکھا دیا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی زبان، رسم خط، تعلیمی نظام اور تہذیب و تمدن کی تخریب پر، ہندو تمدن و زبان کی تعمیر کرنے کی کوشش ملک کو ایک خونریز خانہ جنگی (civil war) اور بدترین انقلاب کی طرف لے جائیگی۔

آج سے چند ہی سال پہلے راجپوتانہ اور وسطی ہند کی تمام ہندو ریاستوں کی درباری، عدالتی، اور کلچرل زبان، فارسی و اردو تھی، لیکن اب محض ہندو سبھا کی نو بیدار ہندو نیشنل ازم کے زیر اثر اردو کی جگہ ہندی اور ناگری جاری کی گئی ہے۔ کانگریس نے برسر اقتدار آنے کے بعد جس طرح کریمنل لا امنڈمنٹ ایکٹ کے ذریعہ جبراً ہندی کو جاری کرنے کی کوشش کی ہے وہ ایک تازہ واقعہ ہے جس پر کسی تبصرہ کی گنجائش نہیں ہے

قومیت متحدہ کی تعمیر سے مایوسی

اندریں حالات مسلمانوں، بالخصوص ہندو صوبوں کے مسلمانوں میں تیزی کے ساتھ یہ خیال زور پکڑ رہا ہے کہ مسلمانوں کی نجات کی واحد راہ مسلمانوں کے تعلیمی نظام اور تعلیمی بجٹ کی علیحدگی میں ہے اور قومیت متحدہ کے مفروضہ یا آرزو کے اساس پر کسی نظام تعلیم کو مبنی کرنے کا عملی مطلب بیسویں صدی میں "آریاورتا" تعمیر کرنے اور مسلمانان ہند کو شدھ کرنے کی کوشش کا ساتھ دینا ہے۔

ہندوؤں کی موجودہ پارٹیوں اور لیڈروں کی روش کو دیکھتے ہوئے میں نیشنل ازم کے اساس پر، تعلیم و تمدن کی عمارت کی تعمیر سے مایوس ہوتا جا رہا ہوں جس طرح سر سید علیہ الرحمۃ اپنی بالغ نظری، دوربینی اور خداداد بصیرت سے ۱۸۶۷ء میں مایوس ہو چکے تھے۔

اسلامی ہند کا تعلیمی و تہذیبی نصب العین

اسلامیانِ ہند کا ان انقلابی حالات کے اندر تعلیمی و تمدنی اعتبار سے کونسا نصب العین ہونا چاہیئے؟

یہ ایک اہم ترین سوال ہے۔ اور میں اس کانفرنس کے ہر صاحب نظر مسلم اور مسلمہ سے درخواست کرونگا کہ وہ ہندوستان کے بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر اس مسئلہ پر غور و فکر فرمائیے۔

میری نظر میں اسلامیان ہند کا تعلیمی و تمدنی نصب العین تین لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے یعنی :-

۱- استقلال - ۲- اتحاد - ۳- ارتقا -

استقلال سے مُراد، اسلامی کلچر، مسلم السنہ وادبیات، مسلم رسم الخط، مُسلم نظام تعلیم و تبلیغ، مسلم معاشرت اور اسلامی شریعت و روایات رسُوم و دساتیر کی کامل آئینی آزادی و عملی خود مختاری ہے -

جس نظام تعلیم میں مسلمانوں کی تہذیب و شریعت زبان و رسم الخط روایات و تمدن کی کامل خود مختاری و آزادی کی گارنٹی اور ضمانت کا انتظام نہ ہو وہ ہرگز اس لائق نہیں ہے کہ مسلمان اس کی طرف نظر اُٹھا کر بھی دیکھیں میں مسلمانوں کے قومی کلچر کی آزادی کو اُن کی اسلامی قومیت کی آزادی کی بنیاد یقین کرتا ہوں -

اتحاد سے مراد یہ ہے کہ ملت اسلامیہ ہند ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے - گذشتہ ایک ہزار سال کی تاریخ، علی گڈھ تحریک، اور اُردو زبان نے دس کروڑ اسلامیان ہند و سندھ کے اندر ایک زبردست احساس قومیت پیدا کر دیا ہے جس کی بنیاد اسلامی شریعت پر مبنی ہے - لازم اور ضروری ہے کہ مسلمان اپنے نظام تعلیم کو، آل انڈیا بنیاد پر اس طرح تعمیر کریں کہ مختلف صوبوں کی مخصوص ضروریات کو پورا کرتے ہوئے وہ براعظم ہند میں اپنی قومی وحدت اور کلچرل فردیت کو نہ صرف بحال و برقرار رکھ سکیں، بلکہ اور زیادہ مستحکم و مضبوط بنا سکیں -

جو نظام تعلیم مسلمانان ہند کو نسل، قبلہ، صوبہ، یا فرقہ کی بنیادوں پر ٹکڑے ٹکڑے کرنیوالی ہو وہ قومیت اسلامیہ ہند کی بنیادوں کو ہلانے والا نظام ہے اور مسلمان کسی قیمت پر ملت کے اجتماعی وجود کے ضعف اور نقصان کو برداشت نہیں کر سکتے ہیں -

ارتقاء سے مراد، یہ ہے کہ مسلمان، اسلامی روایات و احکام کی چٹانی بنیاد پر اپنے مخصوص نظام تعلیم کو قائم رکھتے ہوئے، دین و دنیا کے تمام علوم و فنون، صنائع و بدائع مفیدہ میں ترقی کریں، اور تحقیق و ایجاد کا درجہ حاصل کریں اور کسی قوم و جماعت سے کسی میدانِ علم یا دائرۂ فن میں پیچھے نہ رہیں کہ مسلمان کسی قوم سے علم و حکمت، صنعت و حرفت، دین و سیاست، معاش و معاد الغرض کسی امر میں پیچھے رہنے کے لئے نہیں بلکہ اقوام عالم کی امامت کرنے کے لئے مقدر بارگاہ قضا و قدر ہے۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی جدید تنظیم کی صورت

ملت اسلامیہ ہند کے تعلیمی استقلال، تمدنی اتحاد اور علمی و فنی ارتقاء کے نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے نہ صرف یہ ضروری ہے کہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی آل انڈیا تنظیم کو جسے سرسید علیہ الرحمہ کے مبارک ہاتھوں نے قائم کی تھی بحال و برقرار رکھا جائے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس ادارہ کو حقیقی معنیٰ میں ایک زبردست نمایندہ اور آل انڈیا ادارہ بنایا جائے، اور اس کی علی گڑھ کی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں نئے حالات کے مقابلے کی طاقت پیدا کی جائے۔ اس کی کوشش ہونی چاہیئے کہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اسلامی ہند کے مختلف صوبوں کی نمایندہ و ترجمان بن جائے۔ میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ اس کانفرنس میں موجودہ مغربی جمہوریت اور پارٹی بندی اور دھڑا بندی کی خرابیاں پیدا ہوں، میں پارٹی بندی سے آزادی اور تواتر و تسلسل کے ساتھ علی گڑھ کی روایات پر تعامل کو اس کانفرنس کی سب سے بڑی خوبی یقین کرتا ہوں لیکن یہ ضرور ہے کہ اس کو مسلم پبلک زندگی کی لہروں سے مربوط کیا جائے۔ اور

اس کا اہتمام کیا جائے کہ ہندوستان کی مختلف اسلامی تعلیم گاہوں، مدرسوں، اسلامیہ کالجوں، علمی و تعلیمی سوسائٹیوں، اور مقتدر مسلم جماعتوں کے نمایندگان ہر تین سال کیلئے ایک مقررہ تناسب کے مطابق مقرر ہوا کریں اور اس کانفرنس کے سالانہ جلسوں میں شریک ہوا کریں۔

میری رائے ہے کہ ایجوکیشنل کانفرنس کے لئے ایک نئے دستور اساسی کا مسودہ تیار کرنے کی غرض سے پانچ ممبروں کی ایک چھوٹی سی کمیٹی قائم کیجائے جو کانفرنس کے آیندہ کانسٹی ٹیوشن، دستور العمل، اور ذرائع و وسائل کار کے متعلق تحقیق و تفتیش کے بعد کانفرنس کی اسٹینڈنگ کمیٹی کے سامنے رپورٹ پیش کرے۔

اس کمیٹی کو صاف اور واضح الفاظ میں اس کی ہدایت کی جائے کہ وہ آزاد ہندوستان کے اندر آزاد اسلام کی تعمیر اور ملت اسلامیہ ہند کی قومیت کے سیاسی و معاشی، مذہبی و شرعی، تعلیمی و تبلیغی، تمدنی و تہذیبی استقلال کا قیام، مسلمانان ہند کی ساری اجتماعی جدوجہد کا اصل نصب العین ہے اور ضرور ہے کہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس آیندہ محض اسی نصب العین کو تعلیم و تمدن کے میدان میں حاصل کرنے کے لئے تقسیم عمل کے اصول کے مطابق کوشش کرے، جس طرح آل انڈیا مسلم لیگ، سیاسیات و معاشیات کے میدان میں کوشاں ہے کہ ملک کے نظام سلطنت و نظام قانون و نظام دولت آفرینی کے اندر مسلمانوں کے حق، حصہ اور آزاد مرتبہ کو مضبوط و مستحکم کیا جائے۔

آل انڈیا مسلم لیگ نے واردھا اسکیم کے مقابلے میں ایک مسلم تعلیمی اسکیم مرتب کرنے کے لئے ایک کمیٹی قائم کی ہے، ہماری تجویز ہے کہ آل انڈیا مسلم

ایجوکیشنل کانفرنس کی مذکورہ مجوزہ کمیٹی مسلم لیگ تعلیمی کمیٹی کے ساتھ مل کر کام کرے، تاکہ مسلمانوں کے تعلیمی و تمدنی ضروریات کے لیے ایک متفقہ اسکیم مرتب کی جا سکے۔

مدارس عربیہ کی اصلاح و ترقی کا مسئلہ

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے بنیادی پانچ اغراض ہیں، جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، تیسری غرض، علوم مشرقی اور اسلامیات یعنی علوم و فنون اسلامیہ کی اعلیٰ تعلیم کی ترقی کی کوشش تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ علی گڑھ تحریک ہی کے اثر سے دار العلوم ندوۃ العلما، مجلس ندوۃ العلما، اور دائرۃ المعارف حیدرآباد کی تحریکات جاری ہوئیں اور مدارس عربیہ کی تجدید و اصلاح کے لیے کچھ کام ہوا، لیکن مختلف وجوہ و اسباب کے باعث، کانفرنس اپنی اس غرض کے حاصل کرنے کی طرف متوجہ نہیں ہو سکی۔ مدارس عربیہ و اسلامیہ آج بھی ان مدارس میں حدیث، و تفسیر، اور جدید زبان و ادب عربی کی تحصیل سے زیادہ فرسودہ یونانی فلسفہ و منطق اور دقیانوسی طبعیات کی تعلیم پر زور دیا جاتا ہے اور مسلمانوں کی نسل جدیدہ کی عمریں گنوائیں اور عقلیں عقیم و کند کی جاتی ہیں۔ موجودہ عربی زبان میں جو اعلیٰ علوم و فنون منتقل ہو چکے ہیں ان سے بھی یہ عربی مدارس بالکل بے خبر ہیں یہاں تک کہ ان کے طلبا، ساری عمر عربی پڑھنے کے بعد بھی ایک عرب اہل زبان سے عربی میں نہ بات چیت کر سکتے ہیں اور نہ عربی کے ایک اخبار یا مجلہ کو سمجھ سکتے ہیں ان عربی مدارس کے محصلین سند فراغ لینے کے بعد بھی ہندوستان اور عرب کے حدود اربعہ، جغرافیہ اور تاریخ اور ابتدائی سائنس اور ہائیجن اور ریاضی کے اصول و مبادیات سے محض

سے بے خبر ہوتے ہیں۔

یہ حقیقت مسلمانانِ ہند کے تعلیمی نقشے میں سب سے بدنما داغ ہے مسلمانوں کے لئے علوم اسلامیہ کی حفاظت و ترقی نہایت ضروری ہے۔ مدارس عربیہ و اسلامیہ کو بہر نوع، علوم اسلامیہ اور ضروری علوم عصریہ کا مرکز ہونا چاہیئے۔ ان کے نصاب سے فرسودہ اور غیر ضروری مضامین کو خارج اور ضروری مضامین کی تعلیم کو اس میں داخل کرنا چاہیئے۔ اور سب سے زیادہ زور قرآن، و حدیث اور علوم شرعیہ کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم و تحقیق اور حفاظت و اشاعت پر زور دینا چاہیئے۔

ہمیں معلوم ہے کہ قدیم نصاب کے مطابق تعلیم پائے ہوئے اُستادوں اور مدرسوں کے ناظموں کا ایک گروہ جو خود کسی جدید نصاب کے مطابق عاجز و قاصر ہے، مدارس اسلامیہ کے نصاب کی تجدید کی کوشش کی قدرتاً اپنے اغراض وابستہ یعنی ویسٹیڈ انٹریسٹ کے باعث مخالفت کرے گا۔ لیکن چند شخصوں کے "اغراض وابستہ" اور ویسٹیڈ انٹریسٹ کی خاطر ملت کی نسل جدید کی دینی و دنیاوی زندگیوں اور تعلیمی مستقبل کو آخر کب تک برباد ہونے دیا جائے گا۔

میں کانفرنس کے ارباب حل و عقد سے درخواست کروں گا کہ وہ اصلاح پسند علمارِ حق کے مشورہ کے ساتھ مدارس اسلامیہ کی اصلاح و ترقی کی طرف جلد توجہ کریں اور جو کام علامہ شبلی نعمانیؒ اور مجلس ندوۃ العلما نے شروع کیا تھا، اُس کو دوبارہ جاری کریں۔ مجھے امید ہے کہ اب مسلمانوں کے حالات و خیالات میں بہت زیادہ ترقی ہو چکی ہے اور اصلاح کی تحریک پہلے سے زیادہ کامیاب ہوگی۔

دینی مدارس اور دنیاوی مدارس کے درمیان جو تفریق اور خلیج فاصل حائل ہے، ضرور ہے کہ اس کو کم سے کمتر کرنے کی کوشش کی جائے کیونکہ اسلام میں دین و دنیا، روح و مادہ اور معاش و معاد کے تثنیہ اور تصادم کا تصور ناممکن ہے

انگریزی درسگاہوں میں دینیات

انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں دینیات اور اسلامی روایات و تاریخ کی تعلیم پر اس کانفرنس کی ابتدا سے زور دیا جاتا رہا ہے اور حقیقت میں یہ اس کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد ہے۔ افسوس ہے کہ اب تک اس مقصد میں جتنی کامیابی ہونی چاہیئے تھی نہیں ہوئی۔ دینیات کی تعلیم کے بغیر مسلمانوں کی کوئی تعلیم مکمل نہیں کہلا سکتی۔ کیونکہ مسلمان کی ساری زندگی، ساری معاشیات، ساری سیاسیات، ساری اخلاقیات، سارے معاملات و مدنیات کا اساس اس کی دینیات پر ہے۔ تجربے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ حقیقی دینیات کے بغیر اخلاق، انسانیت اور تمدن کی زندگی ناممکن ہے۔ اسلام عبد و معبود کے درمیان براہ راست رابطہ قائم کرنا چاہتا ہے اور خدا و بندگان خدا کے درمیان حقوق و فرائض کا ایک مکمل نظام پیش کرتا ہے، اس مقصد میں کامیابی کے لئے اسلامی عقائد و اعمال، اور حضرت رسول مقبول محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحابؓ و خلفار راشدینؓ کی پاک سیرتوں اور تاریخوں کا مطالعہ لازمی و ضروری ہے۔ اسلامی تاریخ کا مطالعہ، دنیا کی تاریخوں کے اندر سب سے زیادہ روح پرور دماغ افروز اور انسانیت آفریں مطالعہ ہے۔

ہماری رائے میں دینیات کی تعلیم میں سیرت النبی اور تاریخ خلفار راشدین و اصحاب کرامؓ کو مرکزی اہمیت حاصل ہونی چاہیئے اور میری گذارش ہے کہ

کانفرنس ان مضامین کو ابتدائی کلاسوں سے لیکر اعلیٰ ڈگری کلاسوں تک جاری کرانے کی عملی تدابیر اختیار کرے۔

سائنس اور ٹیکنالاجی

مسلمانوں کے لیے دوسری اہم ضرورت سائنس اور ٹیکنالاجی میں ترقی حاصل کرنے کی ضرورت ہے

دُنیا کی مذہبی کتابوں میں قرآن ہی وہ کتاب حکیم ہے جس نے آسمان وزمین کے تدبر، تفکر اور تعقل کے ساتھ علمی مطالعہ ومشاہدہ پر سب سے زیادہ زور دیا ہے اور مسلمان ہی وہ پہلی قوم تھے جنھوں نے علوم طبعیہ کی تحقیق میں سب سے زیادہ مشاہدہ، تجربہ اور ریاضی کے اصول سے کام لیا اور موجودہ سائنسوں اور جدید منطق استقرائی (Inductive Logic) کی بنیاد رکھی۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ مسلمان سائنس کے مختلف شعبوں کی تعلیم وتحقیق میں دوسری جماعتوں سے پس ماندہ ہیں۔ یہ ایک بڑی بدنامی اور ذلت کی بات ہے کہ مسلمان علوم اور فنون عصری کی تعلیم میں دوسری جماعتوں کے پیچھے شمار کیے جائیں، ضرور ہے کہ لایق وفایق نوجوانوں کو، جو سائنس اور ریاضی کیطرف مائل ہیں خاص وظائف کے ذریعہ اعلیٰ ترین تعلیم کا موقع دیا جائے۔ اور یہ کوشش ہر صوبہ، ہر شہر اور ہر ریاست میں ایک خاص پلان کے مطابق کی جائے۔

سائنس کی اعلیٰ تعلیم میں ترقی جتنی ضروری ہے اسی قدر ٹیکنالاجی یعنی فنون اور صنعتوں کی علمی وعملی تعلیم میں ترقی ومہارت ضروری ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ سارے ہندوستان میں مسلمانوں نے اپنے نوجوانوں کیلئے

ایک بھی Polytechnic یعنی ٹکنیکل کالج قائم نہیں کیا ہے اور دوسری قوموں اور حکومتوں کی طرف سے جو ٹیکنیکل مدارس قائم ہیں ان میں مسلمان طالب علموں کی بہت زیادہ کمی ہے۔ غربت اور تیاری کا فقدان اس کے اسباب ہیں جب یورپ میں برادران وطن نے جو ٹیکنالاجی کا کالج قائم کیا ہے وہ ایک لائق تحسین کارنامہ ہے۔ ہماری آرزو ہے کہ مسلمانان ہند کم سے کم بنگال، پنجاب، بمبئی، علی گڑھ اور حیدرآباد میں اس طرح کے مرکزی ٹیکنالاجیکل کالج اور اسکول قائم کرنے کی کوشش کریں۔ مسلمان جبتک سائنس اور ٹیکنالاجی اور جدید ترین صنعت و حرفت، تجارت و زراعت کے میدانوں میں ترقی حاصل نہیں کریں گے، دنیاوی و مادی لحاظ سے ان کی حالت درست نہیں ہوگی اور وہ اغیار کی تابعداری و غلامی سے ہرگز آزاد نہیں ہوں گے۔ موجودہ زمانہ دراصل سائنس اور انڈسٹری کا زمانہ ہے۔ اس دور میں وہ قوم زندہ نہیں رہ سکتی ہے جو سائنس اور جدید صنعت گری (انڈسٹریل ازم) کے میدان میں پس ماندہ ہو۔ لازم اور ضروری ہے کہ مسلمان جلد سے جلد اس نکتہ کو سمجھ لیں اور اپنی پس ماندگی اور کمزوری کو دور کریں ورنہ زندگی کے میدان مقابلہ میں ان کا ٹھہرنا محال و ناممکن ہے۔

فوجی اسکول اور تربیت گاہ

مسلمانان ہند اس بات پر بجا طور سے فخر کرتے ہیں کہ وہ ایک بہادر فوجی اور فاتح قوم کی روایات عالیہ کے ورثہ دار ہیں۔ آج بھی وہ انڈین آرمی کے سب سے بڑے عنصر اور ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ مسلمان ہندوستان کے سرحد دار اور محافظ ہیں۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں نے جدید ترین

فوجی تعلیم و تربیت کا کوئی اہتمام ابتک نہیں کیا ہے۔ اگر مسلمان زندگی کے دوڑ میں دوسری جماعتوں کے مقابلے میں اپنی پوزیشن کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو لازم و ضروری ہے کہ وہ :۔

(۱) ایک فرسٹ کلاس فوجی اسکول و تربیت گاہ قائم کریں۔

(۲) انگلش پبلک اسکول کے نمونے پر پبلک اسکول قائم کریں

(۳) مسلمانوں کے پوشیدہ جوہرِ قیادت کو دریافت اور پرداخت کرنے کی پوری کوشش کریں۔ جو "پیدائشی لیڈر" کے جوہر رکھنے والے نوجوان دریافت ہوں ان کی ہر طرح ہمت افزائی کریں۔

ایجوکیشنل کانفرنس کے محترم بانی سر سید علیہ انڈین آرمی سے (INDIANIZATION) کی تحریک کے سب سے اول محرک تھے۔ وہ ہندوستان میں ہاشمی رجمنٹ اور قریشی رجمنٹ دیکھنے کی تمنا کیا کرتے تھے، اور اسلام کے عظیم الشان فوجی روایات کو زندہ کرنے کا خواب دیکھا کرتے تھے۔ ضروری ہے کہ یہ کانفرنس اپنے بانی کے خواب کی تعبیر کی کوشش کرے۔

صحافت اور پریس کی تعلیم

لیکن موجودہ زمانے میں صرف توپ و تفنگ اور بحری و فضائی طاقتوں کے ذریعہ جنگ نہیں کی جاتی ہے، بلکہ عہد حاضر میں جنگ کا سب سے زبردست ہتھیار "پریس پاور" ہے۔ مسلمان صحافت اور پریس پاور کے دائرہ میں صفر کے برابر ہیں۔ سارے ہندوستان میں آج ایک بھی ایسا انگریزی ڈیلی مسلمانوں کا نہیں ہے جس کو اسلامی اور آزاد کہا جا سکے۔ یہ امر مسلمانان ہند کیلئے باعث ننگ و عار ہے۔ یہ کانفرنس مسلمان نوجوانوں کو صحافت اور جرنلزم

اور پریس کے کاموں کی عملی تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کیلئے بہت کچھ کر سکتی ہے۔ فرسٹ کلاس اخبار اور پریس چلانے کیلئے سرمایہ کی جتنی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ اعلیٰ کاروباری و انتظامی صلاحیت اور صحافتی مہارت کی ضرورت ہے۔ اور یہی شعبہ ہے جس کے لئے ایجوکیشنل کانفرنس مسلمانوں کی تعمیری خدمت انجام دے سکتی ہے۔

آل انڈیا مرکزی تعلیمی بیت المال

ان تمام اسکیموں اور ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے دو باتوں کی فراہمی لازمی ہے۔ اول "دُھن کے پکے" لایق اور مخلص خادموں کی جماعت، جو تعریف و تنقید سے بے پروا ہو کر ان مقاصد کے لئے اپنی زندگیاں وقف کرنے اور مذہبی جوشِ جنوں کے ساتھ تعمیر ملت کے کام انجام دینے کیلئے تیار رہوں۔

دوسری لازمی شرط ایک زبردست تعلیمی بیت المال کی ہر مسلمانوں کو کوشش کرنی چاہیئے کہ کانفرنس کی زیرِ نگرانی ایک زبردست تعلیمی بیت المال قائم ہو جائے اور مسلمان خود اپنی پسند سے، شادی بیاہ اور دوسری تقریبات سے موقعوں پر اپنے اوپر ایک خاص تعلیمی ٹیکس عاید کر کے اسکے لئے سرمایہ فراہم کریں۔ صوبائی حکومتوں سے ٹیکس وصول کرنے والی مشینری کے ذریعہ وہ اس بیت المال کے لئے خاص فنڈ جمع کرنے کی کوشش کریں۔ مسلمانوں کے جو رقوم سیونگ بنکوں اور دوسرے بنکوں میں جمع ہیں اور جن کے سود کو وہ وصول کرنا ناجائز جانتے ہیں، اُن کو عیسائی مشینریوں کے حوالے کرنے سے بہتر ہے کہ وہ اس تعلیمی بیت المال کے حوالے کئے جائیں۔ اسی طرح جو مسلمان لاولد ہو کر بلا وصیت کئے ہوئے فوت ہوتے ہیں ان کے املاک بحق سرکار

ضبط ہو جاتے ہیں حالانکہ شرع محمدی کی رُو سے، ایسے مسلمانوں کے اموال مسلم قوم کا قومی و جماعتی ترکہ ہے۔ ضروری ہے کہ ان اموال کو بھی قانوناً اسی آل انڈیا مسلم تعلیمی بیت المال کی طرف منتقل کرانے کی کوشش کی جائے۔ تعلیمی اوقاف کی آمدنیوں کا بھی ایک حصّہ اس تعلیمی بیت المال کے حوالہ کیا جائے۔ مسلم تجار، بیوپاری، کسان اور ملازمین دفتر جو کٹوتی مختلف ناموں سے نکالتے ہیں اُس میں تعلیمی بیت المال کی ایک کٹوتی کا بھی اضافہ کریں۔

ہمیں امید ہے کہ جب ایک دفعہ یہ تعلیمی بیت المال قائم ہو جائے گا تو ملک کے لوگ خود اسکی طرف متوجہ ہونگے اور آہستہ آہستہ مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کیلئے عظیم الشان قومی سرمایہ جمع ہو جائے گا۔

مسلم اقلیّات کو تعلیمی شدھی سے بچانے کا مسئلہ

موجودہ اور آئندہ ہندوستان میں اسلامی تعلیم و تہذیب کو جو اصل خطرہ درپیش ہے، وہ اُن صوبوں اور ریاستوں میں ہے، جہاں مُسلمان اقلیت میں ہیں ہندوستان کے ان ہندو علاقوں میں سے بعض علاقے تو ایسے ہیں جہاں مسلمان اس وقت بھی "ارتداد" اور "تعلیمی شدھی" کے خطرہ میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ راجپوتانہ، سنتھال پرگنہ، ملکانہ راجپوتوں کا علاقہ، اور سنٹرل انڈیا کے علاقے، اس کی مثال ہیں۔ ان غریب پس ماندہ، فلاکت زدہ مظلوم و محکوم مسلمانوں کی اگر جلد خبر نہیں لی گئی تو وہ ہمیشہ کے لئے ملّت کے واسطے کھوئے جائیں گے۔ اور سیلاب کفر میں بہہ جائیں گے؟

مسلم اکثریت کے صوبوں میں تو آج نہیں تو کل حالت درست ہو جائیگی ان کے واسطے امید کی ایک دُنیا تازہ ہے۔ سوال اصلی ہندو اکثریت کے صوبوں

اور ہندو ریاستوں کے مسلمانوں کی حفاظت کا ہے جن کی پوزیشن کمزور سے کمزور تر ہوتی رہی ہے اور جن کے لئے بڑھتی ہوئی ہندو طاقت و عصبیت کے پیش نظر، بظاہر کوئی اُمید نجات نہیں ہے۔ اور جن کا مستقبل بظاہر بالکل تاریک ہے کیا مسلمانانِ ہند نے اس سوال پر غور کیا ہے؟

ظاہر ہے کہ ان غریب و پس ماندہ مسلم اقلیات کی تعلیمی حفاظت و ترقی کیلئے لاکھوں روپیہ سالانہ خرچ کی ضرورت ہے اور ہندوستان میں نہ تو اسلامی سلطنت ہے جو اتنا سالانہ فنڈ اس غرض کے لئے مخصوص کرسکے اور نہ قوم نے اس کے لئے کوئی دوسری سبیل نکالی ہے۔

میں نے اس مشکل مسئلہ کو حل کرنے کیلئے جو تجویز سوچی ہے، اب آپ حضرات کے سامنے غور و فکر کے لئے پیش کرتا ہوں۔

قرآن و احادیث کی طباعت و تجارت کا مسئلہ

مسلم اقلیات کو شدھی اور تعلیمی و تمدنی ارتداد سے بچانے کی اسکیم

برادرانِ اسلام و خواہرانِ کرام!

میں ایک مدت سے یہ محسوس کر رہا ہوں کہ ہندوستان میں، اسلامی سلطنت نہ ہونے کے باعث، مسلمانوں اور غیر مسلموں، کو قرآن پاک اور احادیث مقدسہ کے چھپنے اور فروخت کرنے کی جو عام، اور مطلق اور بے قید آزادی مل گئی ہے اس سے قرآن پاک کی بے حرمتی ہونے کے علاوہ بہت سے نقصانات پہونچ رہے ہیں۔ اکثر تجارتی فرم اور کاروباری لوگ محض دنیاوی نفع گردی (Profiteering) اور زر اندوزی کی خاطر، قرآن پاک غلط سلط چھاپ چھاپ کر بیچ رہے ہیں، اور لاکھوں روپیہ بٹور رہے ہیں۔ نیز چھاپنے

اور بیچنے کی حالت میں وہ اکثر قرآن پاک کے احترام و تقدس کا بالکل لحاظ نہیں کرتے ہیں، بلکہ قرآن کی توہین کے مرتکب ہوتے ہیں تجارتی لوگوں سے قرآن پاک و مقدس صحائف کے کما حقہٗ احترام کی توقع ہی غلط ہے۔

میں خیال کرتا ہوں کہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس قرآن پاک کی مناسب طباعت و اشاعت کا اہم کام، اپنی نگرانی میں لے اور اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کرے۔ قرآن پاک کی حفاظت و اشاعت اس کانفرنس کے بنیادی اغراض میں سے پانچویں اہم غرض ہے جو اس کے اجلاس اول سنہ ۱۸۸۶ء میں منظوری ہوئی تھی۔ لیکن اب تک کانفرنس اس کے لئے بہت کم کام کر سکی۔

میں تجویز پیش کرتا ہوں کہ ایک مقتدر اور نمائندہ وفد، مسلم لیڈروں اور عالموں اور کانفرنس کے نمائندوں کا والسرائے بہادر کی خدمت میں حاضر ہو، اور ان سے، ایک ایسے آئینی بل کے لئے تائید حاصل کرے جسکے ذریعہ ہندوستان میں غیر مسلموں کیلئے قرآن پاک، احادیث اور فقہ کی کتابوں کی طباعت، اشاعت اور تجارت ممنوع قرار دیجائے۔ مرکزی اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی سے درخواست کی جائے کہ وہ اس مطلب کا ایک بل پیش کرے۔

میں اس سے آگے یہ بھی تجویز پیش کرتا ہوں کہ سارے ہندوستان کے اندر (۱) قرآن پاک (۲) احادیث (۳) اور فقہ کی مسلمہ قدیم کلاسیکل کتابوں کی طباعت واشاعت و تجارت کی مونوپلی (Monopoly) بحق ملت اسلامیہ محفوظ کر لی جائے اور ملت اسلامیہ ہند کی طرف سے ان کتابوں کی مختلف صورتوں اور اڈیشنوں میں طباعت واشاعت کا کام، ایک ایسی مجلس علماء کے حوالہ کر دیا جائے جو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے ماتحت اس کام کی علمی و اداری

حیثیت سے نگرانی فرمائے۔ اس مجلس کے صدر، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے صدر شعبہ دینیات اور سکریٹری، معتمد مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نواب صدر یار جنگ مولینا حبیب الرحمٰن خاں شروانی سابق صدر الصدور امورِ مذہبی دولت آصفیہ حیدرآباد دکن ہوں۔ مجلس کے ممبر ہندوستان کے مقتدر و معتبر علمائے کرام و ماہرین ہوں۔

قرآن پاک، احادیث اور فقہ و تفاسیر وغیرہ کی اُن قدیم کلاسیکل کتابوں کی ایک فہرست بنائی جائے جن کی طباعت و اشاعت کو بحق ملت محفوظ کرنا ضروری خیال کیا جائے۔ تفسیر و شرح اور فقہ وغیرہ کی نئی کتابیں اس تحفظ و تقید سے مستثنیٰ ہونگی۔ یعنی قدیم کلاسیکل کتابوں کے علاوہ، نئی مذہبی کتابوں کی طباعت و اشاعت کا حق، ملت اسلامیہ کی نمائندہ کی حیثیت اس کانفرنس کیلئے قانوناً محفوظ ہوگا۔ اس تجارت سے جو نفع ہوگا وہ تعلیمی بیت المال کے شعبہ اسلامیات کیلئے مخصوص ہوگا۔ میرے خیال میں کتب مقدسہ مندرجہ فہرست مذکورہ کی طباعت و تجارت سے جو نفع حاصل ہوگا، اس کو، اس کانفرنس کے اغراض نمبر۲، نمبر۳ اور نمبر۴ پر خرچ کرنا چاہیئے یعنی (۱) اوّلاً اس فنڈ کو عام اسکولوں میں دینیات کی تعلیم کے انتظام (۲) ثانیاً علوم مشرق اور دینیات کے اعلیٰ مدارس اسلامیہ کی ترقی و تائید اور (۳) ثالثاً جدید مکتب سسٹم کے ذریعہ، عام مسلمانوں اور بالخصوص، اُن علاقوں، صوبوں اور ریاستوں کے مسلمانوں میں جہاں مسلمان اقلیتیں کس مپرسی اور مذہبی و تعلیمی ارتداد کے خطرہ میں ہیں اسلامی تعلیم کی اشاعت کی غرض سے خرچ کیا جائے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان دینی کتابوں کی تجارت کے نفع سے دینیات کی عام ابتدائی اور اعلیٰ اسلامی تعلیمات کی ترقی کا کام لیا جائے اور کسی دوسرے کام میں اس آمدنی کو خرچ نہ کیا جائے۔

آپ حضرات کو معلوم ہے کہ راجپوتانہ، سنتھال پرگنہ، سنٹرل انڈیا کے

بہت سے علاقوں کی مسلمان اقلیتیں تعلیم اسلامی کے انتظام نہ ہونے کے باعث ملکانوں کی طرح ارتداد کے خطرہ میں ہیں آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ کئی ہندو ریاستوں کے اندر کم و بیش تعلیمی شدھی کی اس پالیسی پر عمل ہو رہا ہے اور اردو اور اسلامی تعلیم کے نشانات کو اسی طرح مٹایا جا رہا ہے جس طرح مہاراجہ الور نے اپنی ریاست میں قانوناً مٹانا چاہا تھا۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ ہندوستان کے اُن صوبوں میں جہاں ہندو اکثریت ہے اور جہاں کانگریس کو اقتدار حاصل ہے، وہاں اُردو مکاتب، اور مسلم مدارس، اور عام تعلیمی مقاصد اور اسلامی کلچر کے ساتھ بہت بُرا سلوک ہو رہا ہے، اور اس کا خطرہ ہے کہ اگر مسلمانوں نے منظم اور مستحکم انتظام ان کے مقابلے کا نہیں کیا تو اُن علاقوں میں مسلمان سخت خطرہ میں ہوں گے۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ اس خطرۂ عظیم کے مقابلے کے لئے لاکھوں روپیہ اور مستقل کارکنوں کی فوج درکار ہے۔

لیکن اگر ہماری تجویز کو عملی جامہ پہنایا گیا اور قرآن و حدیث کی طباعت و تجارت کو اس کانفرنس کیلئے قانوناً محفوظ کر لیا گیا۔ تو پھر انشاء اللہ لاکھوں روپیہ کی مستقل آمدنی ہمارے تعلیمی بیت المال کو خاص دینیات اور اسلامیات کے شعبہ کے لئے نہایت آسانی سے حاصل ہو جائیگی، جو کانگریسی صوبوں اور ہندو ریاستوں میں خصوصاً اور سارے ملک میں عموماً، عام ابتدائی اسلامی تعلیم اور اسلامیات اور علوم و فنون دینیہ کی اعلیٰ تعلیم و تحقیق کیلئے زبردست سہارا ثابت ہوگی

اگر مسلمانوں نے اپنی مخلصانہ و مسلسل جد و جہد سے اس مہم میں کامیابی حاصل کر لی تو ہم کو من حیثیت القوم اس اسکیم سے بہت فوائد حاصل ہوں گے اور عام ابتدائی اسلامی تعلیم کی حفاظت و اشاعت کے علاوہ اعلیٰ اسلامی مدارس کو بھی تقویت حاصل ہوگی۔ اس سے غیر مسلموں کو کوئی نقصان

نہیں پہونچتا ہے، لیکن مسلمانوں کو فائدہ پہنچتا ہے اس لئے کوئی معقول وجہ نہیں کہ دیگر جماعتیں خواہ مخواہ ہمارے اس قومی مطالبہ کی مخالفت کریں۔

میں درخواست کرتا ہوں کہ ہمدردان قوم اس تجویز پر غور فرمائیں۔ میں اپنی ناچیز خدمات اس مقصد کے لئے پیش کرتا ہوں۔ اور یقین رکھتا ہوں کہ مسلمانوں نے اتحاد و استقلال سے کام لیا تو وہ اس مقصد کے لئے ضروری قانون پاس کرانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اردو زبان و رسم الخط

اردو زبان اور رسم الخط کی اہمیت محتاج بیان نہیں۔ اردو ہندوستان کی گذشتہ تاریخ کی سب سے روشن اور اتحاد پرور یادگار رہی ہے۔ آج سے تھوڑے ہی عرصہ پہلے بنگال اردو کا گہوارہ تھا۔ موجودہ اردو نثر نویسی کی ابتدا اسی کلکتہ میں ہوئی تھی۔ اردو کے بڑے بڑے ادیب و شاعر بنگال میں ہو چکے ہیں۔ اور ان کے باقیات صالحات اب بھی جہاں تہاں پائے جاتے ہیں، لیکن آج اسکولوں کے جدید نظام کی بدولت یہ حالت ہے کہ اردو سے ایک گونہ مغائرت بڑھتی جارہی ہے اور اس کا خطرہ محسوس کیا جارہا ہے کہ اگر پرانی نسل ختم ہوئی اور حالات کی اصلاح نہیں کی گئی تو غالباً بنگال میں اردو کا سمجھنے والا بھی کوئی نہ ہوگا۔ اس کا تدارک صرف اس طرح ممکن ہے کہ کم سے کم مسلمانوں کے لئے اسکولوں میں اردو کو امتحان کا ایک لازمی سکنڈ لینگویج (زبان ثانوی) قرار دیا جائے۔ بنگال میں اب تک یہ تجویز کیوں عمل کا جامہ نہیں پہن سکی، اس کے اسباب میں سب سے بڑا سبب، کلکتہ یونیورسٹی کا عدم تعاون ہے جس کو بنگال کے اسکولوں، کالجوں، اور نصابوں پر غیر معمولی اختیارات حاصل ہیں حالانکہ یہ یونیورسٹی نہ صوبے کے

ہندوؤں کی باضابطہ نمایندگی کا دعویٰ کر سکتی ہے اور نہ مسلم اکثریت کی نیابت سے اسکو دور کا واسطہ ہے۔ لیکن بایں ہمہ اپنی موجودہ صورت میں سارے بنگال کے مسلمانوں، اچھوتوں اور دوسری جماعتوں اور خود عام ہندوؤں کے تعلیمی مفاد کی ترقی کی راہ روکے کھڑی ہے۔ میں اس مسئلہ پر علیحدہ بحث کروں گا۔ اسوقت میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ میں اردو کو کم سے کم مسلمانان بنگال کے لئے ایک لازمی مضمون بنانے کا عزم صمیم کر چکا ہوں اور انشاء اللہ عام مسلمانوں کی تائید سے اس میں کامیاب ہونگا۔

اردو رسم الخط کی ترقی و حفاظت کا مسئلہ بھی نہایت اہم مسئلہ ہے۔ خدا کی مہربانی سے مسلمانوں کو اس رسم خط کی بدولت بڑی آسانی و سہولت حاصل ہے فارسی، پشتو، کاشمیری، پنجابی، سندھی اور اردو اسی رسم خط میں لکھی جاتی ہے اور اس رسم خط کی عالمگیریت کے باعث، ہم مختلف صوبوں کے لوگ ذہنی و فکری اعتبار سے ایک دوسرے کے بہت زیادہ قریب ہیں۔ ہم اس رسم خط کی اصلاح و ترقی کی ہر کوشش کا خیر مقدم کریں گے لیکن اسکو کسی دوسرے رسم خط سے بدلنے کی ہر تجویز کے سخت خلاف ہیں۔

زبان کے مسئلہ میں جو چیز سب سے اہم ہے وہ طباعت کا مسئلہ ہے۔ مختلف وجوہ کی بنا پر، موجودہ زمانہ میں ہر زبان کے لئے جلد سے جلد، کم خرچ میں طباعت کا انتظام، اس زبان کی بقا کے لئے ضروری ہے۔ اس زمانے میں کوئی زبان طباعت کی سہولتوں کے بغیر ترقی کرنا تو درکنار، زندہ بھی نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ انگریزی زبان کے لئے سہولتیں پیدا کرنے کی غرض سے لائینوٹائپ Linotype کی مشین ایجاد کی گئی ہے، جس کی مدد سے آج انگریزی زبان کی طباعت کم خرچ اور کم وقت میں، نہایت خوبی سے انجام پاتی ہے اور انگریزی زبان روزانہ پھیلتی

اور ترقی کرتی جاتی ہے۔ اردو زبان کی بدقسمتی تھی کہ اب تک کم لوگوں نے اس مسئلہ کے مناسب حل کی طرف توجہ کی اب تک اردو کی طباعت دقیانوسی طریقہ پر کثیر خرچ سے ہوتی آرہی ہے، جس کی خرابیوں اور مشکلوں سے وہ خوب واقف ہیں جن کو طباعت کے کام سے کچھ تعلق رہا ہے۔

اردو ٹائپوں کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اُن کے جوڑوں اور ٹکڑوں کی تعداد قریباً ڈھائی تین سو ہے اور ان کا ٹائپ رائیٹر میں فِٹ کرنا اور ان سے ٹائپ کرنا نہایت مشکل ہے۔ پریس کے لئے کمپوز کرنا بھی اسی طرح دشوار ہے۔ لائنو ٹیلیشن میں ان کا فیٹ ہونا تو اور بھی مشکل ہے۔

ایک انقلاب آفریں ایجاد۔ "قادری خط" اور اردو لائنو ٹائپ

یہ ایک بہت بڑی رکاوٹ ہماری قومی زبان کی ترقی کی راہ میں تھی اور ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ ہماری اس مشکل کو حل کرنے کی راہ پیدا کرنے والا ہے۔ محبانِ اردو عرصہ سے اس مسئلہ کے حل کے لئے کوشاں تھے۔ لیکن مجھے یہ اعلان کرنے میں انتہائی خوشی و مسرت ہے کہ ہمارے اسی شہر کے ایک نوجوان مسٹر عبدالودود بی اے خلف اکبر مولانا حکیم ابوالبرکات عبدالرؤف صاحب قادری، صدر کلکتہ ضلع مسلم لیگ نے سالہا سال کے تجربات کے بعد ایک خاص خط اور ٹائپ ایجاد کیا ہے، جو ولایت سے ڈھلکر آ بھی چکا ہے۔ اس خط کا نام "قادری خط" رکھا گیا ہے۔ اس کی بعض خصوصیات ایسی ہیں کہ اس سے امید بندھتی ہے کہ یہ اُردو لائنو ٹیلیشن، اردو ٹائپ رائیٹر، اور اردو کمپوزنگ اور پرنٹنگ کے مسئلوں کو حل کردے گا۔

قادری خط کی پہلی اور سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے

جوڑوں اور ٹکڑوں کی کل تعداد صرف اڑسٹھ ۶۸ ہے حالانکہ موجودہ ٹائپوں کی تعداد ڈھائی تین سو کے قریب ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ قادری خط لائنوٹائپ کی مشین اور ہر ماڈل میں یہ فیٹ ہوگئی ہے، اور اس کی مدد سے منٹوں میں کالم کے کالم اور صفحے کے صفحے، لائنوٹائپ رائیٹر کی مدد سے کمپوز ہوسکتے ہیں اور بات کی بات میں اخبارات اور رسائل چھاپے او ر نکالے جاسکتے ہیں۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ قادری خط کے کمپوزنگ میں وقت بہت کم خرچ ہوتا ہے۔

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ خرچ بھی بہت کم پڑتا ہے اور چھپائی بہت ارزاں ہوگئی ہے۔

پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ قادری خط کے ذریعہ اردو ٹائپ رائیٹر بالکل آسان ہوگیا۔

میں قدرداں حضرات اور محبان زبان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ قادری خط کی ممکنات ترقی سے استفادہ فرمائیں اور اس کے ذریعہ زبان کی مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کریں۔

تعلیم نسواں اور "محصنات" کا نصب العین

تعلیم نسواں کے متعلق ایک ایسے مجمع مسلمین میں مجھے کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے جن کے رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے طلب علم کو ہر مسلمان مرد و عورت پر یکساں فرض گردانا ہے اور گہوارہ سے لحد تک تحصیل علم کی تاکید فرمائی ہے اور علماء و فضلا کی روشنائی کو شہیدوں کے خون سے افضل

قرار دیا ہے اور صنعت خداوندی میں غور و فکر کو محض مقلدانہ عبادت و ریاضت سے بہتر بتایا ہے۔ افسوس ہے کہ ہم آج تعلیم نسواں میں تمام اقوام ہند سے پیچھے ہیں۔ آجکل کوئی قوم زندگی کے دوڑ میں دوسری جماعتوں کا کامیاب مقابلہ نہیں کر سکتی ہے اگر اس کا نصف بہتر حصہ جاہل، اوہام پرست، اور اصولِ حفظانِ صحت سے بے خبر، اور زندگی کی ضروریات سے ناواقف ہو۔ اور مصیبت کے وقت اپنے مردوں کے ہاتھ بٹانے کے لائق نہ ہو۔ اس کا عملی نمونہ آپ آج کل کی برسرِ اقتدار یورپین قوموں کی موجودہ جنگی جدوجہد میں دیکھئے جہاں عورتوں نے مردوں کے قریبًا تمام سیول کا اپنے ذمہ لے لیا ہے اور وہ نہایت کامیابی کے ساتھ دفتروں، کارخانوں، آفسوں اور بڑے بڑے پُرپیچ اور دشوار سرشتوں کے کام انجام دے رہی ہیں۔ یہی ہر آزاد و متمدن قوم کی عورتوں کا حال ہے۔ ترکی کی خواتین علم و فن سے مسلح ہو کر، ملک و ملت کی تعمیر و مدافعت میں زبردست حصہ لے رہی ہیں۔ حتیٰ کہ ترکی عورتوں نے فوجی اور ہوائی فورسوں میں بھی اپنی خاص جگہ حاصل کی ہے۔

ضروری ہے کہ مسلمانانِ ہند اپنی عورتوں کو علم و فن سے آراستہ کرنے اور ان کو قوم و ملت کی نئی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے لائق بنانے کی غرض سے ضروری تدابیر عمل میں لائیں لیکن ہمیشہ اس نکتہ کو اصل الاصول بنا کر اپنے سامنے رکھیں کہ مسلمان عورت کا نصب العین اچھی اور "مسلمان" ماں بننا، اپنے خاندان کی حفاظت کرنا اور اسلامی معاشرت کی مدافعت کرنا ہے۔ قرآن حکیم نے ایسی مسلمان خواتین کو جو اپنے جوہرِ نسوانیت، خاندان اور اسلامی معاشرت و شریعت کی حفاظت کرنے والی ہیں بجا طور پر "محصنات" کا نہایت معنی خیز لقب سے یاد کیا ہے اور قرآن پاک کے ایک حصے کو اسی نام سے موسوم کرنے کی خاص عزت بخشی ہے۔ "محصنات" کے اصلی

معنی قلعہ اور مستحکمات کے ہیں۔ ہماری عورتیں، ہماری قومیت کی آخری مدافعت کی لائین ہیں۔ ہماری عورتیں۔ ہمارے اہلی و خاندانی زندگی ہماری قومی و اسلامی معاشرت، ہمارے ملی روایات و تاریخ، ہماری زبان و ادب، ہماری تہذیب اور کلچر، اور ہماری ماضی، حال اور مستقبل اور ہماری نسل موجودہ و آئندہ کے قلعے اور فولادی حصار ہیں۔ یہی باعث ہے کہ امت اور اُمومت میں خاص تعلق لفظی و معنوی ہے۔

بزبان اقبال :-

حافظِ رمزِ اُخوت مادران!
قوتِ قرآن و ملت مادران!

یہی نصب العین ہے جس کے ماتحت خاکسار نے، کلکتہ میں پردہ زنانہ کالج خاص مسلم لڑکیوں کی تعلیم کے لئے قائم کیا ہے۔ ہماری تمنا ہے کہ یہ کالج مسلم خواتین کی اسلامی تربیت و تعلیم کا مرکز و گہوارہ بن جائے، اور اس کا نصب العین قرآن کے الفاظ میں ہماری لڑکیوں کو دین و ملت کے "محصنات" بنانا ہو۔

کلکتہ یونیورسٹی

حضرات و خواتین!

میں نے قصداً و عمداً اب تک مسلمانان بنگال کی تعلیمی ضروریات کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔ کیونکہ یہ مسئلہ بحیثیت وزیر تعلیم بنگال خاص میری ذاتی ذمہ داری کا مسئلہ ہے۔ مسلمانان بنگال کی تعلیمی ترقی کی راہ میں

سب سے بڑی رکاوٹ کلکتہ یونیورسٹی کا بالکل غیر موزوں، نامنصفانہ اور غیر عادلانہ و غیر جمہوری کانسٹی ٹیوشن ہے۔ یہ یونیورسٹی کہنے کو سارے بنگال کی یونیورسٹی ہے اور اس کو سارے بنگال کے اسکولوں اور کالجوں کے الحاق، معائنہ اور کنٹرول اور نصاب کے اختیارات حاصل ہیں لیکن حقیقت میں اس میں بنگال کی ۵۵ فیصدی مسلم اکثریت اور تیس فیصدی سے اوپر اچھوت و پس ماندہ اقوام کی مطلق کوئی نیابت اور کوئی آواز حاصل نہیں ہے بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ اس میں پندرہ فیصدی اونچ ہندو جاتیوں کی بھی کوئی قانونی و باضابطہ نیابت کسی اصول نمایندگی کے مطابق حاصل نہیں ہے۔ حق یہ ہے کہ کلکتہ یونیورسٹی کسی قوم و جماعت کی بھی اصلی نمایندہ نہیں ہے اور وہ صوبے کی کسی خاص ملت کی طرف سے بولنے کا حق نہیں رکھتی ہے۔ اور نہ اس کے سینٹ اور سنڈیکیٹ کے ممبروں کا اسطرح انتخاب عمل میں آتا ہے کہ بنگال کے مختلف باشندوں کو اس میں کوئی نمایندگی اور آواز حاصل ہو۔ اس کے تعلیمی، علمی اور انتظامی شعبوں میں مسلمان صفر کے برابر ہیں پھر بھی یہ اُس صوبے کی تعلیمی پالیسی کے جزو کل پر حاوی ہے جس کی آبادی کا ۵۵ فی صدی حصہ مسلمان اور تیس سے اوپر پس ماندہ اقوام پر مشتمل ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی ایک خودساختہ و خودپرداختہ اور (Self-Elective) مجلس ہے جو چند اغراض وابستہ Vested Interests کا قلعہ بنا ہوا ہے اور ملک معظم کے چارٹر اور حکومت کی تائید سے مسلمانوں اور پس ماندہ قوموں اور دوسری جماعتوں پر، برہمنیت کی تعلیمی اجارہ داری قائم رکھنے پر مُصر ہے۔ اور اسی کو جمہوریت اور انصاف بتاتی ہے۔ میں یہ کہنے میں بالکل حق بجانب ہوں گا کہ کلکتہ یونیورسٹی نہ صرف ہندوستان کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی یونیورسٹی ہے بلکہ دنیا میں حکومت اور قانون کے نام سے پوری قوم پر چند گنے ہوئے شخصوں کی علمی و تعلیمی امارت و ریاست کی بدترین مثال ہے۔

بورڈ آف سکنڈری اینڈ انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن

یونیورسٹی کمیشن نے بہت مدت ہوئی اس کی اصلاح کی سفارش کی تھی، اور سکنڈری اور انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن بورڈ قائم کرنے کی رائے دی تھی تاکہ یونیورسٹی کے دائرہ حکومت سے اسکولوں اور انٹرمیڈیٹ کالجوں کو الگ کر دیا جائے اور اُن کا بہتر نظام، قوم کی خواہشات وضروریات کے مطابق کیا جائے۔ میں انشاء اللہ کلکتہ یونیورسٹی ایکٹ کی ترمیم اور بورڈ آف سکنڈری اینڈ انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن قائم کرکے رہوں گا۔ اور انشاء اللہ اس کی راہ میں جتنی رکاوٹیں ہیں وہ سب بالآخر پبلک کی تائید سے دور ہو جائیں گی۔

اُردو کی مخالفت کہاں سے ہو رہی ہے

اس مشکل کے رفع ہونے کے ساتھ بنگال میں اردو کو مسلمانوں کیلئے ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے جاری کرنے کی راہ میں جو رکاوٹ ہے وہ بھی دور ہو جائے گی۔ مجھے معلوم ہے کہ مسلمانان بنگال اور بہت سی دوسری جماعتیں چاہتی ہیں کہ اسکولوں میں اردو ایک لازمی مضمون قرار دیا جائے لیکن جاتی ہندوؤں کی اجارہ دار ٹولی جو کلکتہ یونیورسٹی کو اپنا موروثی ترکہ بنا کر پورے بنگال کے اسکولوں کے نصاب تعلیم پر حکمران ہے، نہیں چاہتی کہ مسلمانوں کی یہ خواہش پوری ہو، حالانکہ اس سے ان کا کوئی نفع نقصان نہیں ہے اور نہ اس سے ان کا کوئی تعلق ہے کیونکہ ہماری گورنمنٹ، مدراس کی کانگریسی وزارت کی طرح ہندی کو کمپلسل ایکٹ کے نفاذ کے ذریعہ جبراً لوگوں پر تھوپنا نہیں چاہتی ہے، بلکہ دوسری قوموں کے لئے اسکو ایک اختیاری مضمون بنانا، اور مسلمانوں کے لئے ایک لازمی مضمون بنانا چاہتی ہے۔ لیکن اس سخت متعصب تنگ نظر، ٹولی کے نزدیک

ہر وہ تحریک جس سے مسلمانوں کو فائدہ ہو یا اُن کے اتحاد قومی کو تقویت ہو ایک قابلِ مذمت تحریک ہے اور یہی معیار ہے جس سے اس کے نیشنل ازم کے طول، عرض اور حجم کو ناپا اور تولا جاتا ہے۔

مسلمانانِ بنگال اسلامی ہند کے سب سے بڑے حصے کی نمائندگی کرتے ہیں لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال کی دیوانی کی بخشش ۱۷۶۵ء (۲) لارڈ کارنوالس کی دوامی بندوبست ۱۷۹۳ء (۳) موقوفہ زمینوں ورلکیتوں و معافیوں اور معاشوں پر قبضہ کرنے کی تحریک جس کو (Resumption Proceedings) کہتے ہیں۔ (۴) لارڈ میکالے کی خالص مغربی تعلیم پھیلانے اور مشرقی علوم کی تعلیم کی سرپرستی کی موقوفی ۱۸۳۵ء اور (۵) عدالتی زبان کی حیثیت سے فارسی اور اردو کی موقوفی ۱۸۳۷ء اور ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی کے بعد آج تک حکومت برطانیہ کی مسلمانوں کی تعلیم سے مجرمانہ غفلت بلکہ مسلمانوں کی بربادی و تباہی و خرابی کی بنیاد پر دیگر جماعتوں کی ترقی کی عمارت کھڑا کرنے کی پالیسی نے مسلمانانِ بنگال کو آسمانِ حکومت و ریاست سے گرا کر خاکِ مذلت و مسکنت میں ڈال دیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج تک مسلمانانِ بنگال اپنے آپ میں نہیں آسکے اور اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہو سکے۔ موجودہ وزارت باوجود انتہائی مشکلات میں مبتلا ہونے کے انتہائی کوشش کر رہی ہے کہ پبلک کی اس بڑی آبادی کو جو ہندوستان کی گذشتہ دو صدیوں کے انقلابِ حکومت اور انقلابِ تعلیم و تمدن کی تباہ کاریوں کا سب سے اول اور سب سے زیادہ شکار و آماجگاہ ہوئی ہے، انتہائی غربت و جہالت کی پستی سے نکالے اور اسلامی ہند کا ایک زندہ اور قابلِ فخر عضو بنا دے

آپ دعا فرمائیں کہ اللہ ہماری اس آرزوئے خدمت کو پوری فرمائے۔

آخر میں، میں پھر ایک بار، سارے مسلمانانِ بنگال اور مسلمانانِ کلکتہ کی طرف سے آپ کا دلی خیر مقدم کرتا ہوں۔

خدا آپ کے ساتھ ہو اور آپ کو ملتِ اسلامیہ ہند کی بہترین تعمیری خدمات کی توفیق دے۔ اور

علی گڑھ کانفرنس کو ہندوستان میں تہذیب و تعلیم اسلام کی ترقی و آزادی کا منارۂ اُمید بنائے!

آمین ثم آمین

کانفرنس گزٹ

کے متعلق

پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس صوبجات متحدہ کا رزولیوشن

(جو کانفرنس مذکور کے اجلاس دہم منعقدہ ۲۰ر اکتوبر ۱۹۳۳ء میں پاس ہوا)

"یہ کانفرنس اس امر کو بہ نظر استحسان دیکھتی ہے کہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے تعلیمی و اصلاحی اغراض نیز اپنے مقاصد کی تبلیغ و اشاعت کے لئے اپنا اخبار کانفرنس گزٹ جاری کیا ہے جو اپنے مفید و پرمغز تعلیمی و اصلاحی مضامین کی بنا پر اہل علم کی ستائش حاصل کر چکا ہے۔ چونکہ ہر انسٹی ٹیوشن کے لئے ایک آرگن کی ضرورت مسلّم ہے، یہ کانفرنس اس اخبار کی ضرورت تسلیم کرتے ہوئے پبلک کو اس کی مالی و اخلاقی اعانت پر متوجہ کرتی ہے۔"

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی بی اے کا ریویو ہفتہ وار کانفرنس گزٹ پر

"(یہ) پرچہ پندرہ روزہ کی حیثیت سے نکل رہا تھا اور "سچ" مرحوم میں اس کا تذکرہ بھی آ چکا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اب ہفتہ وار ہو گیا ہے اور کئی نمبر اب تک اس جدید حیثیت میں نکل چکے ہیں۔ شرافت و متانت اس کا امتیازی جوہر ہے، یہ مدح کوئی معمولی مدح نہیں۔ گنتی کے چند ہی اخبار ہیں جو اس معیار پر پورے اتریں گے۔

نہ کسی کی پگڑی اچھالتا ہے، نہ بد زبانی نہ فحش نویسی، نہ رکاکت و ابتذال شروع سے آخر تک شریفوں کا لکھا ہوا، شریف گھرانوں میں جانے کے قابل، عموماً تعلیم اور اصلاح معاشرت کے مسائل پر لکھا کرتا ہے۔ کاغذ، کتابت و طباعت ظاہری حیثیت سے بھی ہر طرح پسندیدہ، ایسے اخبارات کی عملاً تائید و حوصلہ افزائی کرنا خود اپنی مدد کرنا اور قوم کا بگڑا ہوا مذاق سدھارنا ہے۔"

(اخبار صدق ۱۱ر اگست ۱۹۳۵ء)

ملنے کا پتہ: صدر دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل

کانفرنس گزٹ علی گڑھ

لیعنی

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا تعلیمی و اصلاحی اخبار

جو زیر نگرانی

نواب صدر یار جنگ بہادر آنریری سکریٹری کانفرنس

مہینہ میں چار بار شائع ہوتا ہے اور اس میں علی گڑھ کی تعلیمی تحریکات مسائل تعلیم و تربیت، موجودہ نظام تعلیم اور اصلاح تمدن و معاشرت پر بحث کی جاتی ہے۔ ہندوستان کے اسلامی پریس نے نہایت عمدہ و حوصلہ افزا الفاظ میں اس پر ریویو کیا ہے اور اس کے اخلاقی و اصلاحی بلند پایہ مضامین کی خاص طور پر مدح و ستائش کی ہے۔ طلبہ، اساتذہ، والدین اور عام ناظرین غرض سب کے لئے اس کا مطالعہ مفید اور ضروری ہے۔ اخبار بہت عمدگی و نفاست سے اچھے کاغذ پر چھپتا ہے اور متعدد تعلیم یافتہ و لائق اصحاب اس میں بلند پایہ مضامین لکھتے ہیں اور جدید تالیفات پر خاص اہتمام سے ریویو کر کے ارباب تالیف کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ نمونہ ایک کارڈ لکھنے پر مفت ملتا ہے۔ قیمت سالانہ [illegible]

اڈیٹر: محمد اکرام اللہ خاں ندوی

ملنے کا پتہ: صدر دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل، علی گڑھ